غدر دہلی کے افسانوں کا
آٹھواں حصہ
دلی کی جان کنی
تصنیف مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی مدظلہ
شائع کنندہ
کارکن حلقہ مشایخ بک ڈپو دہلی
اپریل ۱۹۲۵ء
(بار سوم) قیمت ایک روپیہ
صرف سرورق

فہرست مضامین

دہلی کی جاں کنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یا اللہ توبہ۔ کل کی بات ہے دہلی شہر کے اندر ایسی قیامت آئی تھی جسکا ذکر سننے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ کی باغی فوج دہلی میں داخل ہوئی اور انگریزوں کا قتل عام شروع کیا، اس دن سے ۱۴ر تک دہلی شہر میں انگریزوں کی حالت جانکنی اور سکرات کی تھی اور اُن پر کمبخت باغیوں نے اس قدر ظلم ڈھائے تھے جن کا بیان کرنے کو بھی پتھر کا کلیجہ چاہیئے۔

پھر ۱۴ر ستمبر ۵۷ء کے بعد جب انگریزی فوج نے دوبارہ دہلی فتح کرلی۔ اور باغیوں کو بھگا دیا، تو دہلی کے ہندو مسلمانوں پر خصوصاً مسلمانوں پر وہ آفت آئی جسکا بیان کرنا اور آنسو بہانے کے بغیر سُن لینا آسان نہیں اور جس کو "دہلی کی جاں کنی" کے نام سے تعبیر کرنا بالکل سچی اور واقعی بات ہے۔

انہی واقعات کو جو ۱۴ ستمبر ۵۷ء کے بعد دہلی میں پیش آئے قلمبند کیا جاتا ہے اور اسی مجموعہ کا نام "دہلی کی جاں کنی" ہے۔

یہ تمام حالات تاریخی ہیں، ان میں ایک بات بھی زبانی افواہوں سے تعلق نہیں رکھتی۔ اس واسطے یہ مجموعہ ایک مستند تاریخ کی حیثیت رکھتا ہے۔

حالات یا تو انگریزی تاریخوں سے اقتباس کئے گئے جن کا حوالہ اپنے اپنے موقع پر دیدیا ہے یا شمس العلماء منشی ذکاء اللہ مرحوم کی تاریخ ہندوستان سے لیے گئے ہیں۔ منشی صاحب مذکور خود غدر کے ایام میں موجود تھے اور اتنی عقل اور سمجھ رکھتے تھے

کہ واقعات کو اُن کی اصلی صورت میں ایک اچھے مورخ کی طرح لکھ سکتے تھے چنانچہ اُنھوں نے اپنی تاریخ میں جسقدر غدر دہلی کے حالات لکھے ہیں اُن کا بڑا حصہ چشم دید کیفیات سے تعلق رکھتا ہے۔

کتابوں سے زیادہ زبانی حالات کا انبارِ عظیم بھی میرے پاس جمع ہے۔ کیونکہ دہلی کے ہر اُس ہندو مسلمان عورت مرد سے جو غدر میں موجود تھا ملنے اور حالات معلوم کرنے کا مجکو بچپن سے شوق ہے

لیکن اس کتاب میں اُن ہی زبانی روایتوں کو درج کیا گیا ہے جن کی سند کسی معتبر اور چھپی ہوئی تاریخ میں بھی ہو۔ کیونکہ ایک کتاب میں نے غدر کے متعلق ایسی بھی لکھی ہے جس میں سوائے زبانی حکایات کے تاریخی تائید کا کچھ دخل نہیں ہے اور وہ "غدر دہلی کے افسانوں کا پہلا حصہ" ہے۔ اس واسطے اس کتاب میں سوائے تاریخی حالات کے زبانی قصوں سے بہت کم سروکار رکھا گیا ہے۔

میں نے اب تک حالات غدر دہلی کے متعلق سات کتابیں اور رسالے شائع کئے ہیں، جو ہندوستان میں اچھی طرح مقبول اور رائج ہیں، اِن میں پہلا حصہ وہ ہے جسکا ذکر اوپر آیا، اور دوسرے میں انگریزوں کی بپتا کا حال ہے، جو اُن پر فوج کی بغاوت کے بعد دہلی میں پڑی۔ اور تیسرے حصہ میں انگریزوں کے ابتدائی محاصرہ کے حالات کے خطوط ہیں۔ چوتھے میں بہادر شاہ کے مقدمہ کا حال ہے۔ پانچویں میں وہ خطوط ہیں جو غدر کے وقت بہادر شاہ کے نام لوگوں نے یا بادشاہ نے دوسروں کے نام روانہ کئے، اور جو بادشاہ کی گرفتاری کے بعد قلعۂ دہلی میں انگریزوں کے ہاتھ گرفتار ہوئے چھٹے حصہ میں اُن اخباروں کا اقتباس ہے جو ایام غدر میں دہلی شہر کے اندر شائع ہوتے تھے، اور جن کے مضامین کی نسبت یہ شبہ کیا گیا تھا کہ وہ غدر کی آگ بھڑکانے کا باعث ہوئے۔ ساتویں حصہ میں میرزا غالب کا روزنامچہ ہے جو اُنھوں نے زمانۂ غدر

کے حالات کی نسبت لکھا تھا۔

سلسلۂ مذکور میں اِس کتاب کو آٹھواں حصّہ سمجھنا چاہئیے۔ اس میں تمام و کمال تاریخی حالات ہیں، اور حالات بھی وہ جن سے دہلی کی مصیبت کا پورا اندازہ ہو جائے۔

یقیناً وہ مصیبت جو اہل دہلی کو اس زمانہ میں پیش آئی، جاں کنی کی مصیبت سے بھی زیادہ سخت تھی، اور اس کا اندازہ کتاب کے پڑھنے سے اچھی طرح ہو جائے گا کہ اس کتاب کا نام "دہلی کی جاں کنی" رکھا گیا ہے تو غلط اور مبالغہ سے نہیں رکھا بلکہ واقعی طور پر دہلی نے اس زمانہ میں جاں کنی سے بھی زیادہ تکلیف برداشت کی۔ جسکا بیان سُنکر پتھر کا کلیجہ بھی موم ہو کر پگھل جاتا ہے۔

مقصدِ تحریر

اس کتاب کی تالیف کا مقصد صرف یہی ہے کہ قوم و ملک کی آئندہ و موجودہ نسلوں کو اپنے پایۂ تخت کے تاریخی انقلابات سے آگاہی ہو۔ نیز وہ یہ بھی دیکھ لیں کہ لڑائی جھگڑے میں کیسے کیسے مصائب و ہولناک تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج کل کے زمانہ میں بعض ناتجربہ کار جوشیلے نوجوان لڑائی و خونریزی کے خواب دیکھا کرتے ہیں، اُن کو یہ کتاب اچھی طرح بیدار کر دے گی، کہ بے امنی کے نتائج ایسے ہوتے ہیں، اور وہ جان لینگے کہ برٹش گورنمنٹ کے خلاف سرکشی کرنا بہت خطرناک بات ہے، اور تمام ہندوستان کی مشترکہ قوت بھی اسکے شیرازۂ حکمرانی کو پراگندہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

نایاب تصاویر

اس کتاب کے لئے بڑی کوشش و تلاش کے بعد چند نایاب تصاویر بھی حاصل کی گئی ہیں، تاکہ ایامِ غدر کے نامور اشخاص کی اصلی صورتیں لوگ دیکھ سکیں۔

(۱) ایک ان میں بادشاہ کے دربار کا گروپ ہے جس میں تمام اُمراء صف بستہ

حاضر ہیں، اس گروپ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ بہادر شاہ کا نہیں ہے بلکہ اُن کے والد اکبر شاہ کے دربار کا ہے، خیر۔ چونکہ اس سے دربار کی ہیئت ظاہر ہوتی ہے اسواسطے اس کو بھی شریک کتاب کرنا غیر موزوں نہیں ہوگا۔

(۲) دوسرا گروپ بھی بہادر شاہ کے دربار کا ہے، اس میں چند بڑے بڑے نامور لوگ موجود ہیں، جن کا غدر سے خاص تعلق تھا۔ مثلاً شہزادہ جواں بخت۔ میرزا الٰہی بخش حکیم احسن اللہ خاں۔ نواب حامد علی خاں۔ محبوب علی خاں۔

(۳) میرزا مغل بہادر شاہ کے بیٹے تھے اور غدر میں باغی افواج کے سپہ سالار بنائے گئے تھے، ان کی تصویر بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے

(۴) بہادر شاہ کی سکرات کا مرقع بہت دردناک اور تاریخ کا وہ حصہ ہے جو انسان کو عبرت و خوف سے رُلا دیتا ہے۔

یہ تصویریں کہاں سے ملیں؟

بہادر شاہ کا بڑا گروپ عام طور سے بازاروں میں بکتا ہے۔ چھوٹا گروپ جناب لالہ سری رام صاحب ایم۔ اے مصنف "خمخانۂ جاوید" کے قلمی تصویر خانہ سے لیا گیا ہے اور بہت معتبر ہے۔ میرزا مغل اور بہادر شاہ کی سکرات کی تصویر محکمۂ آثار قدیم دہلی کے سپرنٹنڈنٹ سے حاصل ہوئی ہیں اس واسطے بالکل یقینی اور معتبر ہے۔

بہادر شاہ کے وقت آخر کی تصویر میں میں نے کچھ اصلاح کرائی ہے کیونکہ وہ ضروری تھی۔ بہادر شاہ کی چارپائی کے پاس حقہ کی نئے ایسی بُری معلوم ہوتی تھی کہ اُسکو مجبوراً جدا کرنا پڑا تاکہ چہرہ اچھی طرح نظر آسکے۔

ان تصاویر کے حاصل کرنے اور انکی تیاری و اصلاح میں جو کچھ زحمت ہوئی، اُس سے مجھے انکی قدر و قیمت اچھی طرح یاد رہیگی اور اُمید ہے کہ ناظرین بھی اُن نایاب تحفوں کو معمولی نظروں سے نہ دیکھینگے۔ کیونکہ مہینوں کی جد و جہد کے بعد یہ حاصل ہوئی ہیں

۷ر شعبان سنہ ۱۳۴۰ھ یوم چہار شنبہ مطابق ۵ر اپریل سنہ ۱۹۲۲ء نماز ظہر کے بعد شروع کیا۔

حجرۂ ریگ لبیا۔ درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہی (رضی اللہ عنہ) دہلی

حسن نظامی

دہلی انگریزوں سے کیوں ناراض تھی؟

بغاوت ہندوستان کے اسباب انگریزوں نے بھی لکھے ہیں اور ہندوستانیوں نے بھی، انگریزوں اور ہندوستانیوں کے اکثر خیالات کا خلاصہ منشی ذکاءاللہ صاحب نے اپنی تاریخ میں لکھدیا ہے، سر سید احمد خاں صاحب نے بھی ایک لاجواب رسالہ "اسباب بغاوت ہند" کے نام سے لکھا ہے جسکی صداقت پارلیمنٹ انگلستان تک تسلیم کیگئی تھی۔

مگر میں یہاں نہ اُن تمام اسباب کو لکھنا چاہتا ہوں نہ اُن پر بحث کرنیکی کچھ ضرورت معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہ کتاب صرف احوال دہلی سے تعلق رکھتی ہے اور دہلی کے اسباب ناراضی کو شروع میں بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ بعد کے واقعات کی حقیقت سمجھنے میں یہ اسباب مدد دے سکیں۔

دہلی سے مُراد اس شہر کے ہندو مسلمان باشندے اور بہادر شاہ بادشاہ اوران کے خاندان والے ہیں، اور انہی لوگوں نے بعد میں غدر کو مدد دی اور پھر انگریزی فوج کے ستم برداشت کئے۔ لہذا یہاں صرف دہلی والوں کے اسباب ناراضی بیان کرکے اصل کتاب شروع کی جائے گی۔

ان اسباب میں زیادہ تر بہادر شاہ اور اُن کے خاندان کی ناراضی کا بیان ہے مگر یہ وہ ناراضی تھی جسکا اثر تمام باشندگانِ شہر پر پڑتا تھا۔ اور دہلی کا بچہ بچہ اس سے متاثر ہوتا تھا۔ جس وقت بادشاہ اپنی تکلیف کو کسی شعر کے ذریعہ ظاہر کرتے تھے تو شہر کی گلی گلی میں اس کا چرچا ہوتا تھا۔ چنانچہ ولیعہدی کے جھگڑے میں جب بہادر شاہ نے یہ شعر کہا ؎

اے ظفر اب ہی تجھی تک انتظامِ سلطنت بعد تیرے نے ولیعہدی نہ نامِ سلطنت

تو دہلی کے ہر گھر میں اسکا ذکر تھا۔ عورتیں تک اس شعر کو پڑھ کر روتی تھیں، بچے گلیوں میں

مرثیہ کے انداز سے گاتے پھرتے تھے۔

اسبابِ ناراضی کا سلسلہ پوری طرح ذہن نشین نہ ہو گا جب تک شاہ عالم بادشاہ کے وقت سے واقعات کو شروع نہ کیا جائے لہذا پہلے اُن کو لکھا جاتا ہے:۔

شاہ عالم بادشاہ اور انگریز

۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک اور ولزلی کے سپاہیوں نے مرہٹوں کے زور کو شکست دی، اور شاہ عالم بادشاہ انگریزوں کی حمایت میں ایک خاص عہد نامہ کے ذریعہ سے آ گئے، بظاہر شاہِ عالم نے مسٹر کلائو کو اپنی دیوانی یعنی وزارت کا عہدہ دیا تھا لیکن درحقیقت ہندوستان کی سلطنت اُن کے حوالہ کر دی تھی۔

اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے افسروں کا کھلم کھلا یہ خیال نہ تھا کہ ہندوستان پر بحیثیت ایک خود مختار بادشاہ کے حکومت کرے، بلکہ اس کے افسر بادشاہ کی آڑ کو سلطنت کا شکار کھیلنے کے لئے ضروری سمجھتے تھے چنانچہ گورنر جنرل نے کمپنی کی سرکار کو بتاریخ ۱۳ر جولائی ۱۸۰۳ء ایک مراسلہ بھیجا تھا، جسکا مضمون یہ ہے:۔

"فرانسیسیوں کو ہندوستان کے شمالی مغربی اضلاع میں قوت و غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ ہم نے شہنشاہ عالم کو فرانس کے اثر سے چھڑا لیا ہے اور فرانسیسی گورنمنٹ اس زبردست آلہ سے محروم ہو گئی ہے جسکی آڑ میں برٹش گورنمنٹ کے خلاف فرانس کو ہندوستان پر قبضہ کرنا مقصود تھا اب ہم بادشاہ اور اُسکے خاندان کے لئے امن و راحت کے ذمہ دار ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی ریاستیں ہم پر اعتماد کرنے لگی ہیں کیونکہ ہم نے بادشاہ کو مرہٹوں اور فرانسیسیوں کی قید سے رہائی دلوائی ہے اور ہم کو ضرورت ہے کہ ہم سب کی نظروں میں بادشاہ کے حامی نظر آئیں۔"

تیموری دربار کی آخری جھلک
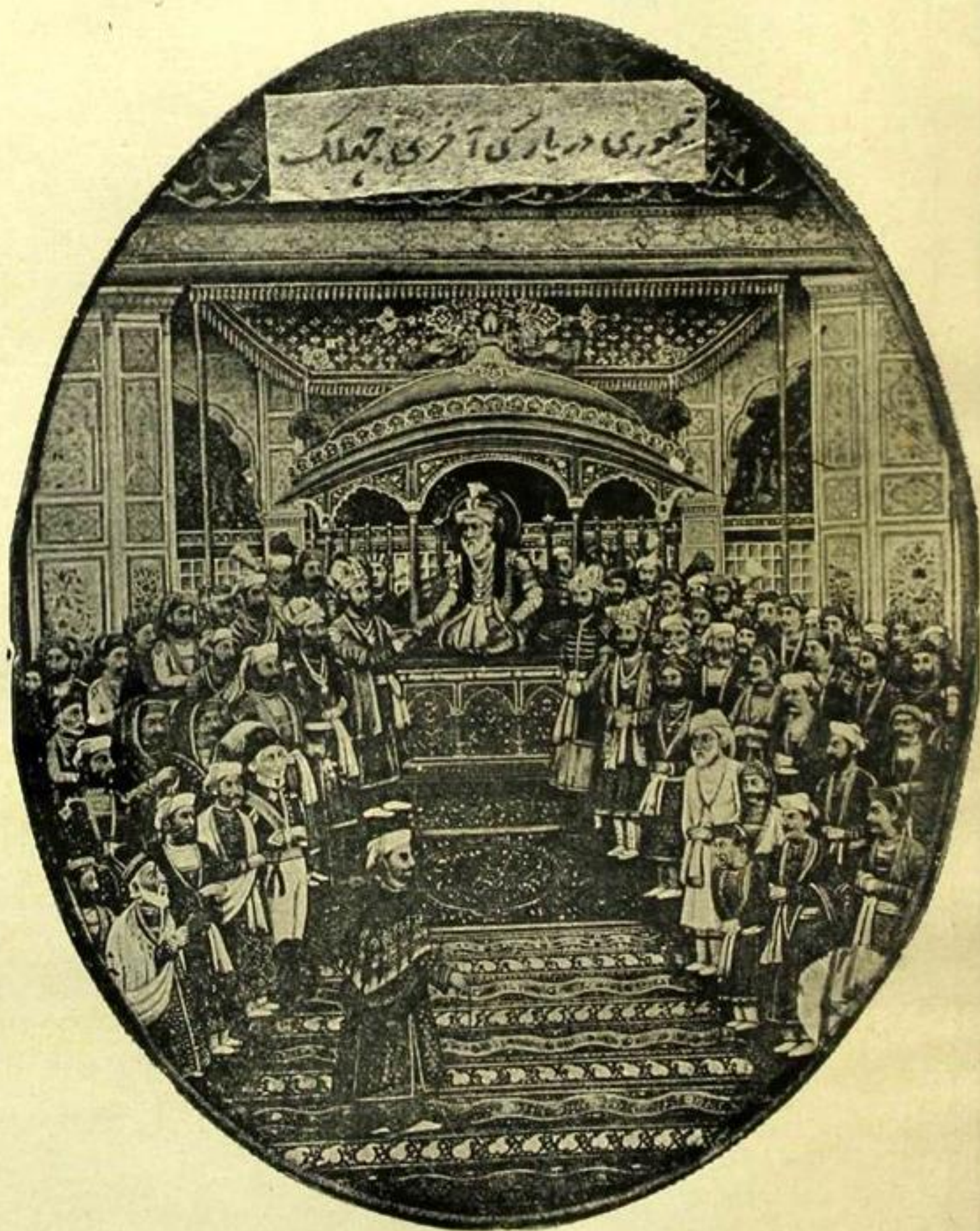
اس مراسلہ سے ظاہر ہے کہ انگریزوں کو فرانس اور مرہٹہ حریفوں کو زیر کرنے کے لئے مغل بادشاہ کے قائم رکھنے کی بڑی ضرورت تھی، اسواسطے فیصلہ کیا گیا کہ ملکی حکومت سے جو عزت حاصل ہوتی ہے اُس کی ایک خاص مقدار بادشاہ کی ذات کے لئے مقرر رہنی چاہئے۔ یعنی خاص حدود کے اندر بادشاہ کو عدالت کرنے کے اختیارات دیئے جائیں جن میں اُن کو زندگی یا موت کے فیصلہ کرنے کا اختیار ہو، بادشاہ اور اُنکے کنبے کو بارہ۱۲ لاکھ روپیہ سالانہ دیا جائے۔ اگرچہ لوگ کہینگے کہ وہ شہنشاہ جو دنیا میں سب سے بڑا تھا تاجروں کی ایک کمپنی کا پنشن خوار ہوگیا ہے، تاہم اس سے برٹش گورنمنٹ کو بہت سے فائدے حاصل ہوں گے۔

بادشاہ کو قلعہ دہلی سے نکالنے کی تجویز

یہ سب کچھ تو ہوا، لیکن لارڈ ولزلی کی دوراندیش آنکھ دیکھ رہی تھی کہ اگر یہ آبائی سلطنت اسی طرح دوامی رہیگی اور بادشاہ اپنے دادا شاہجہاں کے لال قلعہ میں آباد رہیگا اور اس کے وہ مصاحب جنھوں نے پُرانے اختیارات و اقتدارات کے تماشے دیکھے ہیں، اسکے ساتھ رہینگے تو جاں نثار اور جانباز مسلمانوں کا ایک مرکز اور ہیڈ کوارٹر بنا رہے گا، اور کسی نہ کسی دن ایک ایسا وقت آجائیگا کہ اس غارت شدہ سلطنت کو شاہ عالم کے جانشینوں میں سے کوئی شخص دوبارہ بحال کریگا۔ اور ہمارا برسوں کا کام چند روز میں خاک کا ڈھیر ہو کر رہ جائے گا۔ اس واسطے انھوں نے یہ تجویز کی کہ بادشاہ اور اُن کا خاندان دہلی کے لال قلعہ میں نہ رہے بلکہ صوبۂ بہار کے ضلع مونگیر میں مقیم کیا جائے۔ لیکن جب شاہ عالم کو اس تجویز کی خبر ہوئی تو وہ غضبناک ہو گئے اور اُنھوں نے تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر کہا "ایسا کبھی نہیں ہو سکتا مجھ میں ابھی زندہ رہنے کی قوت موجود ہے اور زندہ آدمی کو کوئی شخص اپنی پسند کردہ قبر میں دفن نہیں کر سکتا۔"

لارڈ ولزلی نے موقع کی نزاکت کو سمجھا اور بادشاہ کی خفگی کو اپنے منصوبوں کے لئے
خطرناک خیال کیا، کیونکہ فرانسیسیوں اور افغانوں اور مرہٹوں کی سازشوں کے
جال انگریزوں کو ہمیشہ خائف رکھتے تھے، اس واسطے لال قلعہ سے نکالنے کی تجویز
ملتوی کر دی گئی، تاہم بادشاہ اور ان کے خاندان میں انگریزوں کی نیت سے
ایک عام بدگمانی پیدا ہو گئی، اور یہ دہلی اور اُس کے باشندوں کی اس ناراضی
کی پہلی بنیاد تھی جس کا ظہور ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء میں ہوا۔

اکبر شاہ کی تخت نشینی

۱۸۰۶ء میں شاہ عالم نے انتقال کیا اور اکبر شاہ اُن کی جگہ تخت پر بیٹھے۔ یہ وقت
ایسا تھا کہ قدیمی انگریز ہندوستانی درباروں کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ سیٹن صاحب
دہلی کے رزیڈنٹ بادشاہ کے آگے ادنیٰ امیروں کی طرح تسلیم و کورنش اور مجرا بجالاتے
تھے، اور شاہی خاندان کے بچہ بچہ کی شاہانہ عزت کرتے تھے۔ مگر سیٹن صاحب کے نائب
چارلس مٹکاف صاحب اپنی نوجوانی اور خصلت ذاتی کے سبب بادشاہ کے اس احترام
سے بہت جلتے تھے، اور اُن کا خیال تھا کہ بادشاہ کے احترام کو اس طرح زندہ رکھنا اپنے
حق میں کانٹے بونا ہے، چنانچہ اُنھوں نے اس بارہ میں جو مراسلہ گورنمنٹ کو بھیجا تھا
اُس کی عبارت یہ ہے:-

"میں اس پالیسی کے ساتھ موافقت نہیں کرتا جو سیٹن صاحب نے خاندانِ
شاہی کے ساتھ اختیار کر رکھی ہے، جو شخص برٹش گورنمنٹ کی طرف سے
دہلی میں حکمرانی کے لئے مقرر ہو وہ بادشاہ کی تعظیم اس طرح کرتا ہے جس سے
بادشاہی قوت کے بیدار ہونے کا اندیشہ ہے، حالانکہ ہم اس کو ہمیشہ کیلئے
سُلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا یہ مقصود نہیں ہے کہ بادشاہ کو بادشاہی کے

تیموری چراغ کی آخری
روشنی۔ جو بعد وہ
ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا۔
حکیم احسن اللہ خاں
میرزا فخرو
محبوب خوجہ
بہادر شاہ
نواب
میرزا الٰہی بخش
شہزادہ جواں بخت
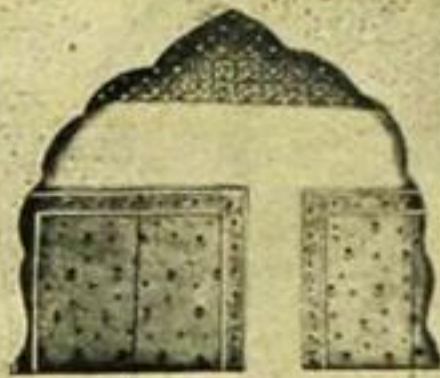
دوبارہ اختیار و اقتدار حاصل ہوں، اسلئے ہم کو ایسی حرکتیں نہیں کرنی چاہئیں جس سے اسکے دل میں اپنی بادشاہی حاصل کرنیکی تمنا پیدا ہو اس کا ادب اسکی شان کے موافق کرنا چاہیئے۔ اسکو خوش وخرم اور آرام وآسایش سے رکھنا چاہیئے اگر ہم نہیں چاہتے ہیں کہ اسکی حکومت کو پھر دوبارہ قائم کریں تو ہم کو چاہیئے کہ بادشاہی کا خیال اُسکے خواب میں بھی نہ آنے دیں۔"

چند سال کے بعد ہی مٹکاف صاحب دہلی کے رزیڈنٹ مقرر ہوگئے اور جب اُن کے ہاتھ میں پوری طرح سے سب اختیارات آگئے تو انھوں نے نہایت نا عاقبت اندیشی سے بادشاہ کی عزت واحترام کے خلاف ایسی ایسی ناشائستہ و نازیبا حرکتیں کرنی شروع کیں جو عقل وانسانیت سے بالکل بعید معلوم ہوتی تھیں، جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ اور اُنکے خاندان اور اُن کے اُمرا اور مذہبی پیشوا اور شہر کے سب باشندے دل ہی دل میں برٹش گورنمنٹ کے خلاف پیچ وتاب کھانے لگے اور ہر شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ ہم کو کسی صورت سے یہ بوجھ اپنے سر سے اتار کر پھینکدینا چاہیئے۔

اور یہ دوسری بنا ناراضی کی تھی جو ایک انگریز نے اپنی قوم کے خلاف ہندوستانیوں کے دل میں ڈالی اور ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو اُس کا نتیجہ دیکھا۔

بہادر شاہ کی تخت نشینی

۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کی شام کو اکبر شاہ بادشاہ نے بیاسی[۸۲] برس کی عمر میں اس جہان سے رحلت کی اور ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ بادشاہ غازی تخت پر بیٹھے۔ بہادر شاہ ۱۱۸۹ھ میں پیدا ہوئے تھے۔ تخت نشینی کے وقت ان کی عمر ۶۰ برس کی تھی، وہ بہت مسکین طبع، صوفی مزاج، خوش بیان شاعر بادشاہ تھے، ان کے باپ نے اپنے دوسرے بیٹے مرزا سلیم عرف مرزا جہانگیر کو ولیعہد بنانے کی کوشش کی تھی، مگر چونکہ مرزا جہانگیر

انگریزوں سے بہت نفرت رکھتے تھے اور انھوں نے سیٹن صاحب رزیڈنٹ پر گولی چلاکر قاتلانہ حملہ کیا تھا اور اُن کو لوگو کہہ کر مذاق اُڑایا تھا اسواسطے انگریزوں نے انکی ولیعہدی منظور نہ کی اور جلاوطن کر کے الہ آباد بھیجدیا۔ پھر اکبر شاہ نے اپنے دوسرے بیٹے مرزا نیلی کے لئے کوشش کی مگر اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ آخر بہادر شاہ کو بادشاہ بنایا گیا۔

جسوقت بہادر شاہ تخت نشین ہوئے لارڈ آکلینڈ ہندوستان کے گورنر جنرل تھے اور سر چارلس مٹکاف لفٹننٹ گورنر تھے۔ یہ وہی مٹکاف تھے جنکی ناعاقبت اندیشی نے بادشاہ اور اُن کے خاندان کو برٹش گورنمنٹ سے ناراض کرانے میں بڑے بڑے کام کئے تھے، بہادر شاہ نے تخت نشین ہوکر سب سے پہلے اپنا وظیفہ بڑھوانے کا مطالبہ کیا، کیونکہ برٹش گورنمنٹ ان کے باپ اکبر شاہ سے اسکا وعدہ کر چکی تھی لیکن مٹکاف صاحب نے اُمید کے موافق اس مطالبہ کی سخت مخالفت کی اور اُن کی مخالفت کے سبب یا کسی اور وجہ سے گورنر جنرل نے بھی گورنمنٹ کے وعدے کو پورا نہ کرنا مناسب خیال کیا اور یہ جواب دیا کہ "بیشک سرکار نے وظیفہ بڑھانے کا وعدہ کیا ہے لیکن وہ جب ہی پورا کیا جائیگا کہ بادشاہ اپنے اُن تمام دعووں سے جو وہ برٹش گورنمنٹ پر رکھتے ہیں باضابطہ دست بردار ہو جائیں" لیکن بہادر شاہ نے جوابدیا کہ "اگر میں باپ کا بیٹا ہوں تو وہی کرونگا جو میرے باپنے کیا اور برٹش گورنمنٹ کی کسی شرط کو قبول نہ کرونگا"

اس ناکامی سے ایک تیسری بنیاد ناراضی کی بادشاہ اور دہلی والوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف پیدا ہو گئی۔

اکبر شاہ مرحوم نے راجہ رام موہن رائے نامور برہمو سماجی کو اپنا سفیر بنا کر لندن بھیجا تھا، وہاں راجہ صاحب کی ذاتی خاطرداری تو بہت ہوئی مگر ان کے حرف مطلب کو ایک انگریز نے بھی آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا اور وہ بیچارے اپنے مقصد میں بالکل ناکام رہے جس کے سبب دہلی کے خاندان شاہی اور عام باشندگان کو اپنے زمانہ آئندہ

کی طرف سے طرح طرح کے خطرے پیدا ہونے لگے۔

بادشاہ کی نذر بند کردی گئی

۱۸۳۷ء میں جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے تو حسب دستور کمانڈر انچیف نے بھی ان کے سامنے نذر پیش کی تھی جسطرح کہ عیدین اور نوروز اور بادشاہ کی سالگرہ کے دن گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے بادشاہ کے روبرو رزیڈنٹ کی معرفت نذریں پیش کی جاتی تھیں۔ مگر لارڈ ڈالہوزی نے ان نذروں کو بھی بند کردیا۔ جس کا بادشاہ اور دہلی والوں کو سخت صدمہ ہوا۔ اسی طرح بات بات میں روزانہ انگریز افسر بادشاہ کی ذلت وتوہین کی باتیں کرتے تھے۔ سر چارلس مٹکاف کو بہادر شاہ اپنے خطوں میں فرزند ارجمند لکھا کرتے تھے۔ سر چارلس مر گئے اور ہاروے صاحب ایجنٹ ہو کر دہلی آئے تو انھوں نے بادشاہ کو لکھدیا کہ مجھکو تمھارا فرزند بننا منظور نہیں ہے مجھے فرزند ارجمند نہ لکھنا۔

جارج طامس

مسٹر جارج طامس نامی ایک بڑے لائق لکھنے والے اور بولنے والے یورپین کو بہادر شاہ نے نوکر رکھا تھا تاکہ وہ اُنکی طرف سے برٹش گورنمنٹ کے سامنے شاہی مطالبات پیش کرے۔ مگر مسٹر جارج طامس کی بھی کسی نے نہ سُنی اور شاہی خاندان اور باشندگانِ دہلی نے یہ یقین کرنا شروع کردیا کہ اب رفتہ رفتہ ہماری روح قبض ہوتی جارہی ہے۔

بادشاہ کی آمدنی

بہادر شاہ کو ایک لاکھ روپیہ ماہوار تنخواہ دی جاتی تھی اور ۱½ لاکھ روپے سالانہ کوٹ قاسم کے علاقہ کا آتا تھا اور شہر کے مکانات کے کرایہ کی بھی کچھ آمدنی تھی۔ اس ایک لاکھ روپیہ ماہوار میں سے ایک ہزار روپیہ مہینہ لکھنؤ بھیجا جاتا تھا جہاں بہادر شاہ کے خاندان کے کچھ لوگ رہتے تھے، اور باقی قلعہ کے کثیر شاہی خاندان میں تقسیم ہوجاتا تھا، اور وہ بادشاہ

جس کے بڑے تمام ہندوستان کے خزانوں کے مالک تھے بڑی تنگدستی سے بسر اوقات کرتا تھا۔

ولیعہدی کا جھگڑا

۱۸۳۹ء میں بہادر شاہ کے ولیعہد دارا بخت نے انتقال کیا۔ اس وقت نئے ولیعہد کے منتخب کرنے کا جھگڑا پیش آیا۔

بادشاہ کو زینت محل بیگم تمام بیگمات سے زیادہ عزیز تھیں، ان کے بیٹے کا نام جواں بخت تھا، چونکہ زینت محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا اور وہ چاہتی تھیں کہ اُن کا بیٹا جواں بخت تخت نشین ہو، اِس واسطے بادشاہ بھی جواں بخت کی ولیعہدی کے لئے کوشش کرتے تھے۔

مگر لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کسی دوسرے ہی خیال میں تھے، اُن کی خواہش یہ تھی کہ کسی طرح دہلی کی بادشاہی کی ظاہری دکھاوٹ بھی ختم کردی جائے۔ اس لئے اُنھوں نے یکم اگست ۱۸۴۷ء کو رزیڈنٹ دہلی کے نام ایک حکم بھیجا تھا کہ "جب دہلی کا بادشاہ مرجائے تو اُس کے جانشین بنانے کے بارے میں ہر معاملہ کی خاص منظوری گورنر جنرل سے لینی چاہئے، اگرچہ تم (رزیڈنٹ) نے لکھا ہے کہ آئندہ جو شخص تخت نشین ہو اُس کو بادشاہ کے لقب سے محروم کردیا جائے، لیکن ہم اس کی موقوفی کا حکم جب تک نہیں دے سکتے کہ اس بارے میں پورے مفصّل حالات تم سے نہ سُن لیں اور جن باتوں کی تم تحریک کرو اُن کے مقصد اور وجوہ پر ہم فرصت میں غور نہ کرلیں۔"

ولیعہد مرزا دارا بخت کا انتقال لارڈ ڈلہوزی کے لئے ایک بہانہ ہوگیا، اور اُنھوں نے پوری سرگرمی سے جانشینی کے مسئلہ میں کام کرنا شروع کیا۔ بہادر شاہ کے ایک لڑکے مرزا فتح الملک عرف مرزا فخرو تیس۳۰ برس کی عمر کے تھے اور انگریزوں کو بہت پسند کرتے تھے، گورنر جنرل نے اس شہزادہ کو اپنے منصوبوں کے موافق پایا۔ چنانچہ

گورنر جنرل نے خفیہ طور پر مرزا فخرو سے ایک عہد نامہ لکھوالیا، جس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ تخت نشین ہونے کے بعد لال قلعہ میں نہیں رہے گا۔ لیکن جبوقت بہادر شاہ کو اس کی اطلاع ہوئی کہ مرزا فخرو کے جانشین بنائے جانے کی تجویز ہے تو بادشاہ نے اسپر اعتراض کیا لیکن بادشاہ اور اُنکے خاندان کی مرضی کے خلاف مرزا فخرو ولیعہد مقرر ہو گئے۔

آخر ۱۰ رجولائی ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو بھی ہیضہ سے انتقال کر گئے تو پھر ولیعہدی کا جھگڑا شروع ہوا۔ مرزا فخرو کی موت کے دوسرے دن سرطامس مٹکاف ایجنٹ دہلی بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، بادشاہ نے ان کو ایک کاغذ دیا جس میں مرزا جواں بخت کی ولی عہدی کا مطالبہ درج تھا اور اس کے ساتھ ایک محضر بھی تھا جس میں بہادر شاہ کے آٹھ بیٹوں کے دستخط تھے اور مُہریں لگی ہوئی تھیں، اس محضر میں لکھا تھا کہ ہم سب خوش ہیں کہ زینت محل کا بیٹا جواں بخت جس میں دانائی، لیاقت علم و خوش اخلاقی کی صفات موجود ہیں ولی عہد مقرر ہو۔ لیکن دوسرے دن بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے مرزا قویاش نے ایک خط رزیڈنٹ کو لکھا کہ بادشاہ نے شہزادوں سے اضافہ تنخواہ کا اور روپیہ دینے کا وعدہ کرکے محضر پر دستخط اور مُہریں کرالی ہیں اور میں نے بھی باپ کے حکم کے موافق اُسپر دستخط کر دیے تھے لیکن میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ولیعہدی میرا حق ہے کیونکہ میں بادشاہ کا بڑا بیٹا ہوں حافظِ قرآن اور حاجی ہوں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ مرزا قویاش کی یہ درخواست ان کی ذاتی خواہش سے نہ تھی بلکہ خود گورنمنٹ کے کارندوں نے گورنمنٹ کے اشارے سے ان کو اس پر آمادہ کیا تھا بہر حال جو کچھ بھی ہو گورنر جنرل لارڈ کیننگ کو لارڈ ڈلہوزی کے پرانے منصوبے کو پورا کرنے کے لئے یہ ایک بہت اچھا ذریعہ مل گیا۔ اس لئے اُنھوں نے اس درخواست کے جواب میں رزیڈنٹ دہلی کو حسبِ ذیل مراسلہ بھیجا:۔

بادشاہی جاہ وجلال کی نقل کے بہت سے زر و جواہر اُتر چکے ہیں جس سے
اس کی پہلی سی چمک دمک نہیں رہی ہے، اور اسکے وہ حقوق جنپر خاندان
تیموریہ کو گھمنڈ تھا ایک دوسرے کے بعد تلف ہو چکے ہیں اسلئے کچھ مشکل نہیں ہے
کہ قلم کے ایک ڈوبے میں بہادر شاہ کے مرنے کے بعد بادشاہ کا لقب
موقوف کر دیا جائے۔ بادشاہ کی نذر جو گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف دیتے
تھے، موقوف ہوئی، بادشاہ کا سکّہ جو بنایا جاتا تھا وہ بھی بند کر دیا گیا، گورنر
جنرل کی مُہر سے بادشاہ کے فدوی خاص کے الفاظ نکالدیے گئے، اور
ہندوستانی رئیسوں کو ممانعت کر دی گئی کہ وہ بھی اپنی مُہروں میں بادشاہ کی
نسبت ایسے الفاظ استعمال نہ کریں، ان تمام اُمور کے بعد اب گورنمنٹ نے
فیصلہ کر لیا ہو کہ ظاہرداری کی اب کوئی بات بھی ایسی باقی نہ رکھی جائے جس سے
ہماری گورنمنٹ بادشاہ کی ماتحت معلوم ہوتی ہو لہذا بادشاہِ دہلی کا لفظ ایسا
لقب ہے جسکا باقی رکھنا نہ رکھنا گورنمنٹ کی مرضی پر منحصر ہے"

اسکے بعد گورنر جنرل نے اپنے ایجنٹ کو لکھا کہ سرکار مرزا قویاش کی جانشینی کو منظور کرتی ہے
تم بہادر شاہ سے کہدو کہ گورنر جنرل مرزا جواں بخت کی ولیعہدی کے منظور کرنے سے انکار
کرتے ہیں، اور مرزا قویاش سے کہدو کہ تمھاری ولیعہدی میں وہ شرائط نہیں ہونگی جو
مرزا فخرو سے کی گئی تھیں، بلکہ اُن کی صورت دوسری قسم کی ہوگی، اُن کو بادشاہ نہیں کہا
جائے گا بلکہ شہزادے کے لقب سے پکارے جائینگے۔ اُن کو قلعہ خالی کرنا ہوگا اور بجائے
ایک لاکھ ماہوار کے ۱۵ ہزار روپئے ماہوار دیئے جائیں گے۔

اور سب سے پُرلطف بات مُراسلۂ گورنمنٹ میں یہ تھی کہ رزیڈنٹ کو حکم دیا گیا
تھا کہ مرزا قویاش کے سامنے یہ تمام شرطیں زبانی پیش کی جائیں، تحریر نہ دی جائے۔

جس وقت مرزا قویاش کی ولیعہدی اور ان شرائط کا علم بادشاہ اور اُنکے خاندان کو

ہوا تو اُن کے دلوں میں غصہ کی آگ بھڑک اُٹھی اور دہلی کے ہر باشندے کو اس خبر سے ملال ہوا اور لوگوں نے یقین کر لیا کہ برٹش گورنمنٹ رفتہ رفتہ جس طرح ہمارے بادشاہ کے حقوق کو فنا کر رہی ہے اسی طرح رعایا کے حقوق بھی اُسکے ہاں محفوظ نہیں ہیں۔

یہ انتہائی ناراضی کا زمانہ تھا۔ ایک طرف پایۂ تخت میں یہ حالت درپیش تھی اور دوسری طرف تمام ہندوستان میں وہ اسباب بےچینی پیدا کر رہے تھے جن کا ذکر سرسید وغیرہ نے اسباب بغاوت ہند میں کیا ہے۔ مرزا قویاش کی ولیعہدی ۱۸۵۶ء میں ہوئی تھی اور ۱۸۵۷ء میں غدر ہو گیا۔ گویا جو پھوڑا مدت سے پک رہا تھا وہ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو آخر کار پھوٹ نکلا۔

رائے

میں مؤرخ نہیں ہوں، مورخوں کے خیالات جمع کر رہا ہوں، مگر ان واقعات پڑھنے کے بعد جو ابھی لکھے گئے ہیں، ہر شخص آسانی سے رائے دے سکیگا کہ بہادر شاہ کے ساتھ جو کچھ برتاؤ ہو رہا تھا وہ گلا گھوٹنے کے ہمشکل تھا اور ایسی مایوسی کی حالت میں اگر وہ انگریزوں کی باغی فوج کے شریک حال ہو گئے، تو یہ ایک قدرتی فعل تھا اگرچہ اُنکی شرکت فوج کے دباؤ اور مجبور کرنے سے ہوئی تھی، تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ بادشاہ اور اُن کے سب ساتھیوں کا خیال ہو گیا تھا کہ ہم سب کو سسک سسک کر مرنے سے ایک دفعہ ہی مرجانا چاہئے۔ چنانچہ اُنھوں نے ایسا ہی کیا اور مر کر ختم ہو گئے۔

دہلی میں غدر کی شروعات

اس کتاب کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے اور پانچویں حصہ میں واقعات غدر کی تفصیل جو دہلی میں پیش آئے پورے طور سے بیان ہو چکی ہے لیکن یہاں بھی سلسلہ بیان قائم رکھنے کے لئے مختصر طور سے ان حالات کو لکھا جاتا ہے جو غدر کی ابتدا میں پیش

آئے، یہ میں نے اوپر لکھدیا ہے کہ غدر کے ان گہرے اور اصلی اسباب کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے، جو تمام ہندوستان میں انگریزی فوج میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کا باعث ہوئے کیونکہ اُن کو سر سید احمد خاں نے ایک مستقل رسالہ "اسباب بغاوت ہند" میں تفصیل کے ساتھ قلمبند کر دیا ہے اور وہ رسالہ علی گڈھ کالج ڈیوٹی شاپ سے آٹھ آنہ کو دستیاب ہو سکتا ہے۔ میں نے تو یہاں صرف دہلی والوں کی بنائے ناراضی لکھنی مناسب جانی، کیونکہ سر سید نے ان باتوں کو اچھی طرح کھول کر نہیں لکھا تھا۔

اب میں

غدر کے حالات

شروع کرتا ہوں، غدر سب سے پہلے میرٹھ چھاؤنی میں شروع ہوا۔ ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء اتوار کے دن صبح کے وقت انگریز لوگ گرجا جانے کی تیاریاں کر رہے تھے اور اُن کو بظاہر کسی بڑے واقعہ کا اندیشہ نہ تھا۔ کارتوسوں کی چربی کا جھگڑا سب انگریزوں کو معلوم تھا اور وہ جانتے تھے کہ فوج بہت برافروختہ ہو رہی ہے، کیونکہ اس سے دو دن پہلے جب پریڈ کے موقع پر سپاہیوں کو کارتوس دئے گئے اور کرنیل سمائتھ نے اُن کو سمجھایا کہ ان میں گائے یا سوٗر کی چربی لگی ہوئی نہیں ہے تم کو یہ غلط خبر دی گئی ہے اگر تم ان کو دانت سے نہیں کاٹ سکتے تو چٹکی سے توڑ سکتے ہو۔ یہ وہی کارتوس ہیں جن کا ۳۰-۴۰ برس سے رواج چلا آتا ہے، مگر سپاہیوں پر اس تقریر کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ اور اُنھوں نے کارتوسوں کے لینے سے انکار کیا۔ اس پر ۸۵ آدمیوں کو حوالات بھیجا گیا۔ پھر ۹ رمئی ۱۸۵۷ء کی صبح کو یورپین اور ہندوستانی فوج پریڈ میں جمع ہوئی اور انگریز افسروں نے ۸۵ ملزموں کو حوالات سے بلایا اور اُن کو دس دس برس کی قید کا حکم سنایا، انکی وردیاں تمام دیسی فوج کے سامنے سرمیدان اُتاری گئیں اور اُسی جگہ اُن کو بیڑیاں پہنائی گئیں، اس نظارہ کو تمام دیسی فوج کھڑی ہوئی دیکھتی تھی، اور قیدی پکار پکار کر

اپنے بھائیوں کو غیرت دلاتے تھے کہ جاؤ تم چوڑیاں پہنکر اپنی بیویوں کے پاس بیٹھ جاؤ ہم پر یہ ظلم ہو رہا ہے اور تم چُپ چاپ کھڑے دیکھتے ہو، تم ہندوستانی نہیں ہو۔ کیونکہ ہندوستانی اپنے بھائی پر عزت وجان قربان کر دیا کرتا ہے۔

باوجود اس ملامت کے دیسی فوج خاموش کھڑی رہی اور اس نے کچھ چون و چرا نہ کی کیونکہ گوروں کی مسلح فوج وہاں موجود تھی اور وہ بے سر و سامانی میں ہتھیار اُٹھانا مصلحت کے خلاف سمجھتے تھے، تاہم اُن کے چہرے غیرت و غصہ سے لال ہو رہے تھے اُن کی آنکھیں طیش کے مارے باہر نکلی پڑتی تھیں، اُن کی گردن کی رگیں پھول رہی تھیں اُن میں سے بعض اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے چباتے تھے اور بعض مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے تھے گویا وہ کہتے تھے کہ ہم تم قیدیوں کا انتقام لیکر رہیں گے۔

جب قیدی پابجولاں وہاں سے روانہ کر دیے گئے تو فوجی سپاہ بھی اپنی بارگوں میں واپس چلے آئے مگر ان کے تیور بہت بگڑے ہوئے تھے، لارڈ کیننگ نے میرٹھ کے اس واقعہ کی نسبت ایک دفعہ کہا "پریڈ پر سواروں کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالنی جس کے اندر کئی گھنٹے لگے ہوں گے اُن سپاہیوں کے سامنے جو سرکار سے پہلے ہی ناراض تھے اور اُن میں بہت سے ایسے تھے جو کارتوس کی چربی کی کہانی پر یقین کرتے تھے خواہ مخواہ ایک تیز ڈنک لگانا تھا، اور انگریز افسروں کی ایسی بیوقوفی تھی جو خیال میں بھی نہیں آ سکتی"

کمانڈر انچیف نے کورٹ مارشل کے فیصلہ کو تو قائم رکھا مگر پریڈ پر بیڑیاں پہنانے کو اُنھوں نے بھی خلاف دستور بتایا۔ اُسی دن شام کو میرٹھ کے بازاروں میں یہ خبر اُڑ رہی تھیں کہ انگریزوں نے دو ہزار بیڑیاں بنوائی ہیں جو کل کے دن باقی ماندہ سپاہیوں کو پہنائی جائیں گی، اُسی رات کو کھانے کے وقت میز کے اوپر انگریز افسروں کو اطلاع دی گئی کہ مسلمانوں نے دیواروں کے اوپر اشتہار لگائے ہیں کہ انگریزوں سے جہاد

کرنے کا وقت آگیا ہے۔

الغرض باوجود ۹ مئی کے ان واقعات کے ۱۰ مئی کی صبح کو انگریز بالکل مطمئن تھے اور گرجا جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ایک انگریز لکھتا ہے کہ اُس روز صبح کے وقت بظاہر تو کچھ ہل چل نہ تھی مگر آسمان کی صورت سے ڈر لگتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان سے کوئی بلا نازل ہونے والی ہے۔ بارگوں کے ہندوستانی نوکر شہر کی طرف بھاگے ہوئے جا رہے تھے، انگریزوں کے ذاتی نوکر بھی نوکری سے غیر حاضر ہوتے جاتے تھے مگر انگریز اسپر بھی زیادہ فکرمند نہ تھے، کیونکہ وہ ہندوستانیوں کو بھٹ کے گیدڑوں کی طرح خاطر میں نہ لاتے تھے، دیسی فوج کی لائنوں میں اور صدر بازار میں ایک بڑی شورش کی علامتیں ظاہر ہو رہی تھیں، یہ چرچا بھی ان کے کانوں تک پہنچا کہ عام طور سے مشہور ہو رہا ہے کہ آج گورے سپاہی سروں سے پاؤں تک مسلح ہو کر کالے سپاہیوں کو ہتھکڑیاں پہنائیں گے، بازاروں کو لوٹیں گے، اور شہریوں کا قتل عام کریں گے، غرض تھوڑی دیر کے بعد دیسی فوج کے سوار اور پیدل جیلخانہ کی طرف گئے جن میں کچھ وردی پہنے ہوئے تھے اور کچھ دیسی لباس میں تھے۔ کرچیں اور پستول ان کے ہاتھ میں تھے، اُنھوں نے جیلخانہ کو توڑ ڈالا اور اپنے فوجی بھائیوں کو قید سے چھڑا لیا۔ اور لوہاروں سے ان کی بیڑیاں کٹوا کر اپنے ساتھ لائن میں لے آئے۔

اُدھر تو انگریز گرجا کی نماز میں تھے اور یہاں قیدی چھڑائے جا رہے تھے، مگر فوج نے نہ تو جیلخانہ کے افسروں کو ستایا اور نہ کسی اور انگریز پر ہاتھ اُٹھایا، اور نہ وہ گرجا پر حملہ آور ہوئے۔ اگر وہ اسوقت گرجا پر حملہ کر دیتے تو ایک انگریز بھی زندہ سلامت نہ رہتا کیونکہ وہاں سب انگریز بے ہتھیار تھے، گرجا کی نماز کے بعد فوج نے دیکھا کہ گورا فوج پریڈ پر تیار کھڑی ہے۔ اور ان کو یقین ہو گیا کہ یہ لوگ ہم کو قید اور قتل کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں اس لئے اُنھوں نے اپنی چھاؤنی کے چھپروں میں بندوقوں

کے فیر کر کے آگ لگا دی، جب انگریز افسروں نے یہ فساد دیکھا تو وہ انتظام کے لئے لائنوں میں دوڑے ہوئے آئے اور سپاہیوں کو دھمکیوں اور خوشامدوں سے سمجھانے لگے، مگر سپاہیوں پر کچھ اثر نہیں ہوا، اُنھوں نے کہا کہ اب کمپنی کا راج ختم ہوگیا۔ تم ہمارے سامنے سے چلے جاؤ۔ ہم تم کو قتل کرنا نہیں چاہتے۔ مگر ہم کو تمھارا بادشاہ بنانا بھی منظور نہیں ہے، لیکن افسروں نے اپنی قوت سے ان کو دھمکانا چاہا۔ جس سے مشتعل ہوکر بیسویں رجمنٹ کے سپاہیوں نے سب سے پہلے بندوقیں اُٹھائیں اور کرنیل فنش پر گولیاں چلائی گئیں، یہ پہلا انگریز تھا جو مقتول ہوکر گھوڑے سے گرا۔ اس کے بعد قتل اور لوٹ مار کا بازار خوب گرم ہوگیا۔ علاوہ کرنیل فنش کے انھوں نے سات دوسرے افسروں کو اور تین افسروں کے بیوی بچوں کو بھی مار ڈالا۔ ان کو جہاں کہیں انگریز مرد، عورت، یا بچہ نظر آتا تھا وہ اُس کو فی الفور قتل کر دیتے تھے۔

دکٹر ہیوگوف لکھتے ہیں، کہ "ہندوستانی شہروں کے مکانات جنگلوں کے بھٹوں کی طرح ہوتے ہیں، جنکے اندر رہنے والے اگرچہ انسانی شکل رکھتے ہیں لیکن وہ نہایت موذی اور ہیبتناک ہوتے ہیں، اور میرے خیال میں ہندوستانی بھٹوں کے انسانوں سے جنگلی بھٹوں کے حیوان اچھے ہوتے ہیں۔ میرٹھ میں یہی دیکھنے میں آیا کہ شہروں اور دیہات کے بھٹوں سے بیشمار ہندو مسلمان نکلکر آگئے تھے اور انگریزوں کے ساتھ درندوں کا سا کام کر رہے تھے۔"

قصہ مختصر تمام دیسی فوج بگڑ گئی اور اُس نے شام کے وقت دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ انگریزی فوج ایسی حواس باختہ ہوئی کہ نہ تو اُس سے اس بغاوت کا انتظام ہو سکا اور نہ وہ باغیوں کا تعاقب کر سکی۔ نہ اُس کو یہ معلوم ہو سکا کہ باغی فوج کدھر گئی۔ حالانکہ میرٹھ میں بہت بڑی جمعیت گورا فوج کی موجود تھی، مگر بقول مسٹر ہیوگوف کے میرٹھ کا برگیڈیر جنرل ولسن ایسا سراسیمہ ہوگیا تھا کہ وہ بالکل نہیں سمجھ سکا کہ اُسے کیا کرنا چاہئے

اُس نے تمام رات شہر کے چاروں طرف گورا فوج کا محاصرہ رکھا مگر ہندوستانی فوج کو دہلی جانے سے نہ روکا۔ اگر اس رات باغی دہلی نہ جا سکتے تو غدر کا یہ قصہ اتنا طول نہ پکڑتا۔

۱۱ مئی۔ دہلی کا غدر

منشی ذکاء اللہ صاحب لکھتے ہیں

"۹ مئی ہفتہ کا ذکر ہے کہ مسٹر الیف ٹیلر پرنسپل دہلی کالج نے مولوی سید محمد صاحب مدرس اوّل عربی سے پوچھا کہ شہر کی کیا خبر ہے تو اُنھوں نے کہا کہ میرٹھ میں غدر مچنے کی خبریں مشہور ہو رہی ہیں اور لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ اب انگریزی عملداری کا خاتمہ ہونے والا ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ دیوانوں کے خیالات ہیں ورنہ آپ کی سرکار کا انتظام ایسا اعلیٰ درجہ کا ہے کہ آپ کی سلطنت میں خلل پڑنے کا کچھ بھی اندیشہ نہیں ہے۔ مولوی صاحب کی یہ بات سُنکر پرنسپل صاحب نے اپنا ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھایا اور کہا کہ سلطنت خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ انسان کے انتظام پر نہیں ہے"۔

میرٹھ میں انگریزی فوج پریڈ کے میدان میں پڑی سوتی رہی اور تیسرے رسالہ کے ہندوستانی سوار چاندنی رات میں گھوڑوں پر سوار دہلی کی طرف دوڑتے رہے اور کسی جگہ بھی اُنھوں نے لگام کو نہ روکا۔ یہاں تک کہ صبح نماز کے وقت وہ دہلی پہنچ گئے اور پہنچتے ہی انگریزی بنگلوں اور کوٹھیوں میں آگ لگانی شروع کر دی اور جو انگریز ملا اُس کو مار ڈالا۔ یہاں تک کہ عورتوں اور بچوں کے ساتھ بھی نہایت بیرحمی کا سلوک کیا گیا۔

بیدرد ہندوستانی اور ان کے مظالم

اس کتاب میں انگریزی فوج کے مظالم کا تذکرہ زیادہ آئیگا، مگر اس موقع پر یہ اقرار کرنا قرین انصاف ہے کہ ہندوستانی فوج والوں اور دیسی باشندوں نے بھی

غدر کے شروع میں سفاکی اور بیرحمی کو حد سے بڑھا دیا تھا، اور انکے ستم ایسے ہولناک تھے کہ ہر قسم کی سزا ان کے لئے جائز کہی جاسکتی ہے، انھوں نے بیکس عورتوں کو قتل کیا انھوں نے حاملہ عورتوں کو ذبح کرنے سے دریغ نہ کیا، انھوں نے دودھ پیتے بچوں کو اچھالا اور سنگین کی نوکوں پر روک کر بے زبان معصوموں کو چھید ڈالا - وہ حاملہ عورتوں کے پیٹ میں تلواریں بھونک دیتے تھے۔ غرض کوئی ظلم وستم ایسا نہ تھا جو ان کے ہاتھ سے انگریزوں اور ان کے بیوی بچوں پر نہ ٹوٹا ہو۔

منشی ذکاءاللہ صاحب نے چشم دید حال لکھا ہے کہ" میں نے ایک میم کو دیکھا جسکے آس پاس باغی سپاہیوں کا محاصرہ تھا، وہ دودھ پیتے بچہ کو گود میں لئے جاتی تھی، تولیہ سے بچہ کو ڈھک رکھا تھا۔ ساتھ میں ایک خوردسال لڑکا پیدل چل رہا تھا۔ بازاروالے اس میم کو ننگی تلواریں دکھا دکھا کر قتل کے اشارے کرتے تھے، تلواریں دیکھ کر وہ بچہ ماں کو چمٹ جاتا تھا اور وہ بیچاری بھی سہمکر کھڑی ہو جاتی تھی، یہانتک کہ اُسکو قلعہ میں لیگئے لال قلعہ کے اندر جو انگریز اور عورتیں اور بچے قتل ہوئے وہ بھی نہایت سخت واقعہ تھا، کوئی قوم مذہبی یا ملکی معاملات کے لئے عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کرتی۔ اگرچہ بہادرشاہ عورتوں اور بچوں کے قتل سے بہت ناراض تھے اور انھوں نے آخر تک اس کی اجازت نہ دی کہ اُن عورتوں اور بچوں کو قتل کیا جائے جو قلعہ میں تھے، تاہم ان مظلوموں کو ہلاک کرنے والے بھی ہندوستانی تھے جنھوں نے اپنے رحم دل ملک کے نام کو بٹہ لگا دیا۔ ان کے شرمناک افعال نے تمام ہندوستان کو ہمیشہ کے لئے رحم وانصاف کی نظروں میں ذلیل کر دیا۔

اگرچہ انگریزی فوج کی زیادتیاں بھی اسلئے غیر منصفانہ تھیں کہ اُنھوں نے بیقصور لوگوں کو بھی پھانسی پر لٹکایا یعنی جن لوگوں نے ان کی عورتوں پر ظلم کئے تھے، اُن کے علاوہ بھی بہت سے بے گناہ بغیر کسی تحقیق کے قتل کر دئے گئے، اور دوسری قسم کی

بے احتیاطیاں بھی بکثرت ہوئیں جن کا ذکر آگے آئے گا تاہم میرا سر شرم و ندامت سے اونچا نہیں ہوتا جب میں اپنی قوم کی اس دردناک سفاکی کا حال پڑھتا ہوں جو اُسنے دہلی شہر کے اندر ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے زمانہ میں روا رکھی۔

جب میرٹھ سے بغاوت کر کے سوار اور پیدل دہلی کی طرف روانہ ہوئے تو تمام راستہ اُن کو فکر رہا کہ پیچھے سے انگریزی لشکر آتا ہوگا اس لئے وہ مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے تھے، مگر انگریز تو میدان پریڈ میں پڑے سوتے تھے، باغی دریا کے کنارے پہنچے تو ہندو سپاہیوں نے "جمنا مائی کی جے" کا نعرہ لگایا۔

کمشنر دہلی کی غفلت

مسٹر سائمن فریزر جن کی شہرت آج تک دہلی کے دیہات میں ہے غدر سے پہلے دہلی کے کمشنر تھے۔ ان کی نسبت دہلی میں عام طور پر مشہور تھا اور ہے کہ ان کی نیند نے غدر کی آگ بھڑکائی، اگر وہ نیند کے شوقین نہ ہوتے تو دہلی کا انتظام ہو جاتا اور باغی شہر کے اندر نہ آنے پاتے۔

وہ شہرت یہ ہے کہ جس وقت میرٹھ میں غدر شروع ہوا، وہاں کے افسروں نے بہت روپیہ خرچ کر کے چند ہندوستانیوں کے ہاتھ کمشنر فریزر صاحب کو خط بھیجا تھا کہ یہاں غدر ہو گیا ہے، ممکن ہے کہ باغی دہلی آئیں اس لئے تم وہاں کا بندوبست کرو۔ یہ خط آدھی رات کے قریب دہلی میں کمشنر صاحب کی کوٹھی پر پہنچا۔ صاحب سو گئے تھے۔ (میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ غدر میں مشہور ہوا تھا کہ صاحب نے شراب بہت پی تھی) نوکروں نے جگایا اور خط دیا۔ صاحب نے خط جیب میں ڈال لیا اور پھر سو گئے۔ خط کھول کر نہ پڑھا۔ اور جب خط لانے والوں نے صاحب کے نوکروں سے کہا کہ معاملہ بہت نازک ہے۔ صاحب کو جگاؤ اور کہو کہ خط پڑھ لیں، تو نوکروں نے کہا ہم صاحب کو جگاتے ہوئے

ڈرتے ہیں، وہ بہت تیز مزاج ہیں، چنانچہ کمشنر صاحب کو کسی نے جگانے کی جرأت نہ کی اور صبح تک وہ سوتے رہے اور صبح بیدار ہو کر جب اُنھوں نے خط پڑھا تو اُسوقت بندو بست شروع کیا مگر باغی شہر میں داخل ہو چکے تھے

منشی ذکاءاللہ صاحب کا بیان ہے کہ "خط آنے کی شہرت تو دہلی میں بیشک تھی مگر یہ واقعہ تحقیقات سرکاری سے ثابت نہیں ہوا۔"

ثابت کیونکر ہوتا۔ صاحب تو اار ہی کو قتل ہو گئے تھے، خط بھیجنے والوں نے بھی بات کو دبانے کی کوشش کی ہوگی تاکہ مرنے والے پر غفلت کا الزام نہ لگ سکے، ورنہ صاحب کے گھر کا واقعہ خواہ مخواہ مشہور نہ ہوتا، اور ہندوستانیوں کو ایسی غلط بات مشہور کرنے کی کچھ ضرورت بھی نہ تھی۔

بہر حال اگر خط کا واقعہ سچا ہے تو کمشنر صاحب کی غفلت نے بڑا نقصان پہنچایا اور بعد میں جسقدر خوفناک کشت و خون ہوئے اُن سب کی ذمہ داری فریزر صاحب کی نیند پر ہے اور میرٹھ میں اس کا بوجھ گورہ فوج پر ہے جس نے باغیوں کا تعاقب نہ کیا اور پریڈ کے میدان میں بیٹھے سوتے رہے۔ یہ دونوں ہوشیار ہوتے تو غدر کی روک تھام شروع ہی میں آسانی سے ہو جاتی۔

منشی ذکاءاللہ صاحب نے لکھا ہے:۔ "میں نے خود دیکھا کہ سائمن فریزر صاحب کمشنر دہلی دو گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہیں اور اُن کے پیچھے اردلی میں جھجر کے سوار چلے جاتے ہیں، کمشنر صاحب نے اپنی بگھی کو میگزین کے پاس ٹھہرایا، وہاں تلنگوں کی کمپنی وردی پہنے کھڑی تھی، اس کے صوبہ دار کو کمشنر صاحب نے بلا کر کچھ باتیں کیں جو میں نے نہیں سُنیں، مگر لوگوں نے جب صوبہ دار سے پوچھا کہ کیا باتیں ہوئیں تو اُس نے کہا کہ صاحب کمشنر پوچھتے تھے کہ ہمارا ساتھ دو گے یا نہیں؟ ہم نے کہدیا کہ ہم اپنے دھرم کے ساتھی ہیں، ان تلنگوں نے کمشنر صاحب کی سلامی بھی دستور کے موافق

نہیں اُتاری، کمشنر صاحب نے اپنی سواری آگے بڑھائی، ان کی بگھی کے گرد آدمیوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ جب میں آگے قلعہ کے نیچے لال ڈگی کی سڑک پر آیا تو میں نے دیکھا کہ سڑک پر مسٹر ہچنس مجسٹریٹ دہلی گھوڑا دوڑائے چلے آتے ہیں اور اُن کے پیچھے دو اردلی کے سوار اور شرف الحق کوتوال بھی ساتھ ہیں، پھر تھوڑی دیر کے بعد آٹھ سات ترک سوار خونخوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے دکھائی دیئے، جن کو دیکھ کر میں اپنے گھر چلا آیا۔

فریزر صاحب نے کلکتہ دروازہ کو بند کرادیا تھا۔ باغیوں نے جب اسکو بند دیکھا تو وہ دریا کے کنارے کنارے جھروکوں میں قلعہ کے مثمن برج کے نیچے گئے اور بادشاہ کی دوہائی دیکر کہا " ہم کو اپنے مذہب کے لئے لڑنے کے واسطے بادشاہ کی امداد درکار ہے بادشاہ ہی ہمارے دین و دنیا کے محافظ ہیں " مگر بادشاہ نے اُن کی دُہائی کا کچھ جواب نہیں دیا، اور نہ اُن کے سامنے آئے۔ البتہ بادشاہ نے حکیم احسن اللہ خاں، اور غلام عباس شمشیر الدولہ کو بُلایا اور غلام عباس کو حکم دیا کہ کپتان ڈگلس صاحب قلعہ دار کے پاس جاکر سواروں کے آنے کی خبر دے دو۔ غلام عباس تھوڑی دیر کے بعد کپتان ڈگلس کو اپنے ساتھ قلعہ میں لے آئے۔ کپتان صاحب فوراً برآمدہ میں زیر جھروکہ جو سوار کھڑے تھے اُن سے کہا کہ یہ بادشاہ کی خوابگاہ ہے۔ تم اپنی داد فریاد سے بادشاہ کو تکلیف نہ دو۔ یہ تمہاری فریاد سُننے کی جگہ نہیں ہے، کوٹلے کی طرف جاؤ وہاں جو عرض کرنا ہے کرو، شنوائی ہوگی، سوار راج گھاٹ کی طرف چلے گئے، بادشاہ کپتان صاحب کے آنے کی خبر سُنکر دیوان خاص کے کھُلے صحن میں نکل آئے تو کپتان ڈگلس نے اُن سے کہا کہ حضور گھبرائیں نہیں، یہ شور و شر فوراً رفع کر دیا جائے گا۔

باغی سوار راج گھاٹ کے دروازہ کی طرف آئے، یہ دروازہ بھی فریزر صاحب نے بند کرادیا تھا، مگر جونہی سوار وہاں پہنچے دروازہ خود بخود کھُل گیا۔ دروازہ کھُلنے کی نسبت عجیب و غریب شہرتیں دہلی میں ہوئی تھیں، کوئی کہتا تھا کہ ایک سبز پوش سوار

آسمان سے اُترا اور اُس نے دروازہ کھول دیا، کوئی کہتا تھا پہرے کے سپاہی باغیوں سے مل گئے۔ بہرحال دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر باغی شہر کے اندر گھُسے اور انگریزوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ جب سوار شہر میں داخل ہوئے تو "دین دین" کے نعرے لگاتے جاتے تھے اور دین دین کی آوازیں سُنکر مسلمان باشندوں کی بھیڑ اُن کے ساتھ جمع ہوتی جاتی تھی۔ ہندو باشندے بھی سواروں کو ڈولوں اور بتاشوں کا شربت لُٹیوں میں جگہ جگہ پلا رہے تھے۔

کمشنر صاحب۔ کپتان ڈگلس۔ سر طامس مٹکاف۔ مسٹر ہچنسن صاحب وغیرہ انگریز کوتوالی میں جمع ہوئے۔ جہاں اور انگریز بھی موجود تھے۔ سواروں اور باغی شہریوں نے کوتوالی کو گھیر رکھا تھا۔ اُسوقت فریزر صاحب نے ایک سوار کے گولی ماری جو صاحب کی طرف آگے بڑھا چلا آرہا تھا۔ سوار مرکر گر پڑا۔ اور اُس کے ساتھی سوار ذرا پیچھے ہٹے، لیکن شہری باشندوں نے بندوقوں کی کچھ پروا نہ کی اور نعرے مار کر انگریزوں پر حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر سب انگریز بھاگے۔ قصہ مختصر اپنی قیامگاہ پر پہنچتے پہنچتے مسٹر فریزر، مسٹر ڈگلس اور مسٹر ہچنسن تینوں مارے گئے۔

ایک ہندوستانی کی وفاداری

منشی ذکاء اللہ صاحب کہتے ہیں کہ "مجھ سے رائے شنکر داس وکیل عدالت ججی نے بیان کیا کہ بلوہ کی خبر سُنکر سمتھ صاحب سشن جج نے کچہری برخاست کردی اور گھوڑے پر سوار ہوکر ہنگامہ کی طرف چلے تو ایک بوڑھے درزی نے جو صاحب کا پُرانا ملازم تھا اُن کے گھوڑے کی باگ موڑ کر کہا کہ صاحب مرنے کو کہاں جاتے ہو، اور اصرار کرکے اُن کو آگے نہ جانے دیا۔"

کپتان ڈگلس کے مکان میں دو نوجوان عورتیں بھی تھیں وہ بھی باغیوں کے ہاتھ سے ماری گئیں، دہلی بینک لوٹا گیا۔ اسکا یورپین منیجر مارا گیا۔ دہلی گزٹ پریس کے عیسائی

ملازم قتل کردیے گئے، غرض کہ شہر میں بظاہر حالات انگریزوں اور اُن کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور چھاؤنی میں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی۔ اور انگریزوں کو دہلی سے بھاگ جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا۔ باقی حالات غدر دہلی کے افسانے حصۂ دویم "انگریزوں کی بپتا"، اور حصۂ چہارم "بہادر شاہ کے مقدمہ" اور حصۂ پنجم میں مفصل شائع ہوچکے ہیں۔ اب اُن کے دوہرانے کی ضرورت نہیں۔ حاصل مقصد یہ ہے کہ جہاں جہاں بغاوت ہوتی تھی ہندوستانی فوجیں سیدھی دہلی کی طرف آتی تھیں، اور یہاں سب باغیوں کا مجمع ہوتا جاتا تھا، اور بہادر شاہ کے لڑکوں میرزا مغل و میرزا خضر سلطان وغیرہ نے ان کی افسری قبول کرلی تھی۔

انگریز بھی باوجود پریشان حالی اور چاروں طرف کی بغاوتوں کے پنجاب کے سکھوں، نیپال کے گورکھوں اور پنجابی مسلمانوں کو سمیٹ کر پہاڑی کے مورچے پر آگئے تھے اور دہلی فتح کرنے کو سب سے بڑا کام سمجھتے تھے، کہ دہلی ہی کے اوپر تمام شورشوں کے بڑھنے اور گھٹنے کا مدار تھا۔

لہذا اب دہلی کے باغیوں اور انگریزوں کی لڑائی کے آخری انجام کا ذکر کیا جاتا ہے جو دہلی کی فصیل کے سامنے کئی مہینے ہوتی رہی تھی۔

دہلی پر حملہ کی تیاریاں

ستمبر ۵۷ء کے شروع میں انگریزوں نے باہمی مشورہ سے طے کرلیا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو دہلی کو فتح کرلینا چاہیے۔ اسلئے انجینیر اور قلی اور سب سپاہی بڑے زور شور کی تیاریاں کررہے تھے۔ پہلے اُنھوں نے سمی ہاوس کے بائیں طرف ایک مورچہ بنایا، جس پر چھ توپیں لگائیں تاکہ لاہوری اور کابلی دروازے سے آنے والے دشمنوں کے حملے روکے جائیں اور موری دروازہ کے گرگج سے جو دھواں دھار توپیں چلتی ہیں وہ

بھی بند ہو جائیں، اس کے علاوہ اس مورچہ میں ایک یہ چال بھی تھی کہ حریف یہ سمجھنے لگے کہ انگریز اس طرف سے حملہ کریں گے اور جب وہ اس مورچہ کی طرف متوجہ ہو تو دوسری طرف سے حملہ کر دیا جائے۔

۶ر ستمبر کو تمام سپاہ جو کمک کے لئے آسکتی تھی آگئی تھی۔ جن میں ۶ ہزار ۵۰۰ پیدل تھے اور ایک ہزار سوار اور ۶۰۰ توپچی۔ اس فوج میں گورے سپاہی صرف تین ہزار تین سو سترہ (۳۳۱۷) تھے، دیسی فوج میں سکھ، گورکھے اور پنجابی مسلمان تھے، اور قلی بھی کثیر تعداد میں تھے، انجنیئروں نے خندق بھرنے کے لئے دس ہزار لکڑیوں کے گٹھے اور بالو ریت سے بھرے ہوئے ایک لاکھ تھیلے۔ بیشمار ٹوکرے اور زینے تیار کرلئے تھے ۷ر ستمبر کی شام کو جب رات کی تاریکی پھیل گئی تو یہ سامان اونٹوں اور قلیوں کے ذریعہ سے فصیل شہر کی طرف روانہ کیا گیا، خیال یہ تھا کہ صبح تک سب سامان فصیل تک پہنچ جائیگا، مگر بدقسمتی سے چاند نکل آیا اور اس کی روشنی میں دشمن نے انگریزوں کے سامان کو آتے ہوئے دیکھ لیا، بس دیکھنے کی دیر تھی کہ موری دروازہ کے گڑگج نے توپوں کے ایسے گراب مارنے شروع کئے کہ قلی اور اونٹ اور اکثر سامان چیتھڑوں کی طرح اُڑ گیا۔ لیکن نقصان زیادہ تر آگے بڑھنے والوں کا ہوا تھا۔ پچھلا حصہ ایک حد تک محفوظ تھا۔ باغیوں نے سامنے کا میدان صاف کرکے خیال کیا کہ اب حملہ آوروں میں کوئی بھی باقی نہیں رہا ہے اس واسطے گولہ باری بند کردی اور انگریزی فوج کو ذرا دم لینے کی فرصت ملی۔

دوسرے دن صبح انگریزی توپخانہ نے گولہ باری شروع کی جو اس زور کی تھی کہ دوپہر تک موری دروازہ کا گڑگج مسمار ہو گیا، اور شہر کی فصیل میں بھی بہت سے سوراخ پڑ گئے مگر باغیوں کی گولہ باری سے انگریزوں کا بھی بہت نقصان ہوا، اور میجر کے صاحب کے مورچہ میں جو کشمیری دروازہ کے گڑگج پہ گولہ باری کر رہے تھے آگ لگ گئی جسکو بمشکل

بجھایا جا سکا۔ ۸ ستمبر کو انگریزوں نے لڈلو کیسل فتح کر لیا جو کشمیری دروازہ سے ۵۰۰ گز کے فاصلہ پر تھا اور جہاں کشمیری دروازہ سے نکل نکل کر باغی دھاوے کیا کرتے تھے، جنگی لحاظ سے یہ مقام بہت اہم تھا۔ دسویں ستمبر کو قدسیہ باغ میں ایک مورچہ تیار کیا گیا اور اُسی دن کپتان ٹیلر نے دریائی گڑگج سے ایک سو ساٹھ گز کے فاصلہ پر کسٹم کی کوٹھی میں مورچہ بنایا جو نہایت ہی کامیاب مورچہ ثابت ہوا۔ اور معلوم نہیں کہ باغیوں نے اس مورچہ کا اب تک کیوں خیال نہیں کیا تھا۔ جب یہ مورچے بنائے جا رہے تھے تو باغیوں نے توپوں اور بندوقوں سے انگریزوں کا بہت نقصان کیا۔

۱۱ ستمبر کی صبح کو دونوں طرف سے اِس زور شور سے گولہ باری ہوئی کہ زمین آسمان لرزنے لگے، کشمیری دروازہ کے گڑگج کو اگرچہ خاموش ہونا پڑا لیکن باغی تدبیروں کی جنگ میں کمزور ثابت نہیں ہوئے۔ اُنھوں نے فصیلوں میں سوراخ کئے اور اس طرح سے توپیں وہاں لیجا کر لگائیں کہ انگریزوں کی ہر توپ کے مقابلہ میں ان کی ایک توپ قائم ہو گئی اور پھر اس غضب کی گولہ باری کی کہ انگریزوں کے چھکے چھڑا دیے۔ انگریزی لشکر کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جسکو باغیوں کے گولوں اور گولیوں سے نقصان نہ پہنچا ہو تین سو انتالیس (۳۳۹) آدمی تو بالکل جان سے مر گئے اور زخمیوں کا تو کچھ حساب نہیں۔

۱۳ ستمبر کی رات کو میڈنی صاحب اور لینگ صاحب فوجی انجنیئروں کو حکم دیا گیا کہ کشمیری دروازہ کے گڑگج اور دریائی گڑگج کی خبریں لائیں اور دیکھیں کہ فصیل میں جو شگاف پڑ گئے ہیں وہ فوج کے اندر گھس جانے کے قابل ہیں یا نہیں۔ یہ دونوں دشمنوں کی آنکھ بچا کر خندق کے کنارے پر پہنچے اور اُس کے اندر اُتر گئے اور چاہتے تھے کہ شگاف کے اوپر پہنچیں کہ اُنھوں نے کسی کے آنے کی آہٹ سُنی۔ اس لئے یہ دونوں جلدی سے اُلٹے پھرے اور وہیں خندق میں چپکے سے گھاس کے اوپر لیٹ گئے چاندنی خوب کھلی ہوئی تھی، انگریزوں نے دیکھا چند شکلیں شگاف کے سر پر نمودار

ہوئیں۔ وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اور آواز آتی تھی کہ وہ گزوں سے بندوقوں کو بھر رہے ہیں، یہ دونوں انگریز کئی گھنٹے وہاں لیٹے رہے اور لیٹے لیٹے اُنھوں نے معلوم کر لیا کہ شگاف بہت کافی ہیں۔ لیکن جونہی اُنھوں نے خندق سے باہر جانا چاہا باغیوں نے ان کے گولیاں مارنی شروع کیں مگر انگریزوں کی زندگی باقی تھی، گولیاں سنسناتی ہوئی ان کے کانوں کے پاس سے گزر گئیں۔ مگر کسی کے لگی نہیں۔ اس کے بعد میڈنی صاحب نے رپورٹ بھیجی کہ فصیل میں دراڑیں کافی ہیں، اس پر ہوم صاحب اور گریڈ ہیڈ صاحب نے احکام جاری کئے کہ ۱۴ ستمبر کی صبح کو دہلی پر حملہ کیا جائے گا۔

حملہ کرنے والی فوج کے پانچ کالم بنائے گئے، پہلے کالم کا سردار جنرل نکلسن کو مقرر کیا گیا۔ ان پانچ کالموں میں پانچ ہزار مضبوط سپاہی تھے۔ کیمپ کی حفاظت کے لئے بیماروں اور زخمیوں کو مقرر کیا گیا تھا۔ جاسوسی کے افسر میجر ہڈسن تھے جنکے پاس شہر کی چھوٹی سے چھوٹی بات تک کی خبریں آتی تھیں، اور شاہی خاندان کے آدمی بھی خبریں بھیجتے تھے۔ جاسوسی کے میر منشی رجب علی نامی تھے جنکے کاموں پر انگریزوں کو بہت بھروسہ تھا، اور قلعہ میں میرزا الٰہی بخش بادشاہ کے سمدھی منشی رجب علی کے ذریعہ خبریں بھیجتے تھے:۔

۱۴ ستمبر دہلی کی ہار

انگریزوں کا ارادہ یہ تھا کہ بہت سویرے دہلی پر یورش کی جائے، لیکن سپاہی چونکہ رات بھر پلٹنوں میں جاگے تھے اس واسطے ان کے آنے میں دیر لگی، پہلے ساٹھویں رائفل رجمنٹ غل شور مچاتی ہوئی آگے بڑھی اور اُسی وقت قدسیہ باغ سے جنرل نکلسن نے بھی اپنی فوج کو آگے بڑھایا اور شہر پناہ کے شگافوں کی

طرف چلنا شروع کیا۔ باغیوں نے یہ دیکھ کر اس زور سے گولے اور گولیوں کا مینہ برسانا شروع کیا کہ انگریزی فوج حواس باختہ ہوگئی، اور بہت لوگ مارے گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد زینے آگئے اور جو لوگ فصیل کے قریب پہنچ گئے تھے اُنھوں نے زینے فصیل پر پہنچا دیئے اور سب سے پہلے جو شخص اس فصیل پر چڑھا وہ جنرل نکلسن تھا۔ اور بھی دو چار انگریز اور دیسی لوگ زینوں پر چڑھ گئے مگر وہ زخمی ہوے یا مارے گئے، یا اُن کو واپس ہونا پڑا۔ فصیل کے نیچے اس کثرت سے آدمی مارے گئے کہ شگاف مُردوں سے بھر گئے۔

پرمٹ کی کوٹھی کی طرف سے جس فوج نے حملہ کیا تھا اس کا بھی بہت نقصان ہوا، مگر اس کے باوجود وہ شہر کے اندر داخل ہوگئی۔ کشمیری دروازہ کے قریب انگریزی فوج نے ایک کھڑکی کو بارود سے اُڑا دیا، اور اُس کے اندر سے فوج شہر میں داخل ہوگئی، تو اُنھوں نے جاکر یہ دیکھا کہ وہاں صرف ایک توپ لگی ہوئی تھی، اور اُس کے پاس دو تین باغی تلنگوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ دریائی گڑھ کی فوج اور کشمیری دروازہ کی فوج گرجا کے میدان میں آپس میں جاکر مل گئی اور یہاں پہنچکر وہ ٹھہر گئی آگے نہ بڑھی۔

چوتھا کالم سبزی منڈی سے کشن گنج اور پہاڑ گنج کی طرف حملہ آور ہوا تھا۔ مگر حملہ کے شروع ہوتے ہی ریڈ صاحب جو اس کالم کے افسر تھے سخت زخمی ہوگئے، اور دوسرے بہت سے افسر بھی مارے گئے اور زخمی ہوئے۔ آخر بہت زیادہ نقصان اُٹھانے کے بعد یہ کالم بھاگا۔ اور ہندو راؤ کے باڑے کی طرف چلا گیا۔ وہاں اس کو عیدگاہ کی طرف سے بھاگی ہوئی کشمیری کنٹنجنٹ کی فوج ملی جس سے باغیوں نے ۴ توپیں چھین لی تھیں اور مار مار کر بھُرکس نکال دیا تھا۔

نکلسن صاحب کے حکم سے فوج کا ایک حصہ اجمیری دروازہ کی طرف گیا اور

ایک حصہ کو کابلی دروازہ کے رُخ سے جامع مسجد تک جانے کا حکم ملا۔ کابلی دروازہ پر انگریزی جھنڈا گاڑ دیا گیا، مگر باغیوں نے ایسا سخت مقابلہ کیا کہ اجمیری دروازہ وغیرہ کی فوج بھاگ کر کابلی دروازہ کے پاس آگئی اور برن گڑ گج باغیوں نے پھر فتح کر لیا یہ دیکھ کر نکلسن صاحب نے برن گڑ گج پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے نہایت سخت حملہ کیا۔ مگر جونہی آگے بڑھے میجر جیکب کے گولی لگی، اور دوسرے بھی بہت سے افسر مارے گئے۔ فوج نے افسران کو مرتے ہوئے دیکھا تو اُس کے پاؤں لڑکھڑائے اور بھاگنا چاہا مگر نکلسن صاحب دوڑ کر آگے گئے، اور سپاہیوں سے کہا بھاگو مت میرے پیچھے آؤ۔ یہ کہہ کر فوج کو ساتھ لیا اور آگے بڑھے، مگر فوراً اُن کی چھاتی میں بھی گولی لگی اور وہ گر پڑے، آخر فوج بھاگ کر کابلی دروازہ کی طرف چلی گئی:۔

جامع مسجد کی لڑائی

فوج کا ایک حصّہ سر طامس مٹکاف صاحب کے ماتحت تھا، وہ شہر کے حال سے خوب واقف تھے کیونکہ دہلی کے کلکٹر و مجسٹریٹ رہ چکے تھے، اس لئے وہ اپنی فوج کو ایسے راستوں سے لے گئے جہاں دشمنوں کی آتشباری بہت کم تھی، وہ جامع مسجد تک پہنچ گئے اور جہاں آج کل ڈفرن ہسپتال ہے وہاں کھڑے ہو کر کمک کا انتظار کرنے لگے، اُن کو خیال تھا کہ اجمیری دروازہ، کابلی دروازہ اور سبزی منڈی کی فوجیں حسب وعدہ یہاں پہنچ جائیں گی، اُنھوں نے آدھ گھنٹہ ٹھہر کر انتظار کیا، جامع مسجد میں اُس وقت ہزارہا مسلمان نماز کے لئے جمع تھے، اُن کو معلوم ہوا کہ انگریز مسجد کو بارود سے اُڑانا چاہتے ہیں۔ ان سب کے پاس تلواریں تھیں، بندوقیں نہ تھیں، اُن کا ایک آدمی مکبر پر چڑھا اور اُس نے مسلمانوں سے پکار کر کہا "تمھارے امتحان کا وقت آگیا ہے، انگریزوں کا مقابلہ اپنی باغی فوج سے تھا مگر اب وہ تمھاری مسجد کو ڈھانے

آ ئے ہیں، میں تم کو مرنے کا بُلاوا دیتا ہوں، تم میں سے کون کون جان دینی چاہتا ہے دشمن سامنے کھڑا ہے، جسکو مرنا ہو وہ میرے ساتھ شمالی دروازہ کی طرف آئے، اور جسکو جان پیاری ہو وہ جنوبی دروازہ کی طرف چلا جائے کہ اُدھر دشمن کی فوج نہیں ہے" یہ تقریر سُنکر مسلمانوں نے تکبیر کا نعرہ بلند کیا اور اُن میں سے ایک آدمی بھی جنوبی دروازہ کی طرف نہیں گیا، ان سب نے تلواریں میانوں سے کھینچ لیں اور سب سے پہلے میانوں کو کاٹ کر پھینکدیا گیا۔ گویا اُنھوں نے یہ ارادہ کر لیا کہ اب ہماری تلواریں میان میں نہیں جائیں گی، اُنھوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا جس کی گونج سے مسجد کے در و دیوار ہل گئے، اسکے بعد وہ شمالی دروازہ کی طرف دوڑے، جونہی دروازہ کے باہر آئے مٹکاف صاحب نے بندوقوں کی ایک باڑھ ماری جس سے دو سو آدمی شہید ہو کر گر پڑے اور مسجد کی سیڑھیاں اُن کی لاشوں سے بھر گئیں مگر مسلمان اس پھرتی سے دوڑے کہ دوسرا گراب مارنے کی فرصت مٹکاف صاحب کو نہ ملی، اور تلواروں کی دست بدست لڑائی ہونے لگی، مٹکاف صاحب ان پُرجوش آدمیوں کا مقابلہ نہ کر سکے اور اُن کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ سامنے سے ہٹ جائیں، چنانچہ وہ اور ان کی فوج وہاں سے بھاگی اور کشمیری دروازہ کے گرجا تک مسلمان انکا تعاقب کرتے رہے لیکن جب مسلمانوں نے یہ دیکھا کہ گرجا کے قریب انگریزوں کی اور بہت سی فوج موجود ہے تو وہ سب واپس چلے آئے۔

حواس باختہ جنرل

کیمبل صاحب جو اس لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے کہتے ہیں کہ اگر مجھکو کمک پہنچ جاتی اور بارود کے تھیلے میرے پاس آجاتے تو میں جامع مسجد دہلی کو اُس دن ضرور اُڑا دیتا۔ لارڈ رابرٹس اپنی تاریخ چہل و یک سالہ میں لکھتے ہیں کہ "اُس روز میں جنرل ولسن

کے ساتھ تھا، جنرل لڈلو کیسل کی چھت پر کھڑے ہوئے لڑائی کا رنگ دیکھ رہے تھے جب اُنھوں نے اپنی فوج کی فتحیابی کے آثار دیکھے تو وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کشمیری دروازہ سے گرجا تک آئے، اور دن بھر یہیں رہے، وہ بہت تھکے ہوئے تھے اور بیمار بھی تھے، جب دن ختم ہونے کو ہوا تو اُن کے پاس ایسی بُری بُری خبریں آئیں کہ وہ گھبرا گئے، اور اُن کا دل مایوسی سے بجھنے لگا، انھوں نے سُنا کہ ریڈ صاحب کو شکست ہوئی، اور وہ خود بھی سخت زخمی ہوئے، پھر یہ خبر آئی کہ جنرل نکلسن بھی بہت سخت زخمی ہوئے ہیں، پھر خبر آئی کہ ٹومبس اور ہوپ گرینٹ بھی مارے گئے، ان سب خبروں کو سُنکر جنرل ولسن ایسا سراسیمہ و پراگندہ خاطر ہوا کہ وہ یہ سوچنے لگا کہ مصلحت یہ ہے کہ شہر چھوڑکر پھر اُلٹے پہاڑی پر چلے جائیں، اُسنے مجھے حکم دیا کہ یہ جو رپورٹیں آئی ہیں ان کی حقیقتِ حال دریافت کرو اور کالم نمبر ۴ کی خبر لاؤ، کہ اُسپر کیا گذری؟ میں یہ پیغام لیکر گھوڑے پر سوار ہوا- اور کشمیری دروازہ میں آیا تو میں نے سڑک کے ایک طرف ایک ڈولی رکھی ہوئی دیکھی جس کے ساتھ کہار نہ تھے، میں گھوڑے سے اُترا اور ڈولی کے اندر دیکھا تو دیکھکر حیران ہو گیا کہ اُس کے اندر جنرل نکلسن پڑے ہوئے ہیں، اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ کہار ڈولی رکھکر لوٹنے چلے گئے ہیں، میں اس وقت بڑی تکلیف میں ہوں اور چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی ہسپتال میں پہنچادے، وہ اس طرح لیٹے ہوئے تھے کہ اُن کا زخم دکھائی نہیں دیتا تھا، نہ چہرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے کوئی زخم لگا ہے، اس لئے میں نے کہا آپ گھبرائیے نہیں اچھے ہو جائینگے، آپ کے کاری زخم نہیں لگا ہے تو اُنھوں نے کہا- نہیں صاحب میں تو مر رہا ہوں، میرے جینے کی اب کوئی آس نہیں ہے- یہ سُنکر میں نے فوراً بمشکل چار آدمی تلاش کئے اور اُن کو ایک سارجنٹ کے سپرد کیا اور زخمی افسر کا نام اُسکو بتاکر حکم دیا کہ ان کو ہسپتال میں جلد پہنچادو۔

اس کے بعد میں گھوڑے پر سوار ہو کر ہوپ گرینٹ اور ٹومبس کی تلاش میں نکلا اور ان دونوں کو زندہ پایا، یہ دیکھکر میں فوراً گرجا میں واپس چلا آیا، اور تمام حالات بیان کئے۔ جنرل ولسن یہ خبر سُنکر تو خوش ہوا کہ ہوپ گرینٹ اور ٹومبس زندہ ہیں، مگر مسٹر ریڈ اور مسٹر کیمبل کی ناکامیوں کا اور نکلسن صاحب کے زخمی ہونے کا اور بہت سے سپاہیوں کے مرنے اور زخمی ہونے کا حال سُنکر جنرل کی ہمت پھر پست ہوئی اور اُس نے کہا کہ دانشمندانہ کام یہی ہے کہ فوج کو لیکر اُسی پہاڑی پر چلا جاؤں مگر تمام افسر اس کے خلاف تھے، جنرل نکلسن سے پوچھا گیا کہ ولسن شہر سے واپس آنا چاہتے ہیں تمہاری کیا رائے ہے؟ اُس وقت جنرل نکلسن پر سکرات کا عالم طاری تھا مگر اُنھوں نے غصہ سے بے قابو ہو کر اُسی حالت میں کہا کہ" ابھی تک مجھ میں اتنی قوت موجود ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں ولسن کو گولی سے ماردوں"۔ غرض ولسن صاحب تمام افسروں کی مخالفت سے مجبور ہو گئے اور شہر سے واپس جانے کا خیال ترک کر دیا گیا۔

۱۱ رمئی ۵۷ء کو جو دہلی انگریزوں کے قبضہ سے نکلی تھی وہ ۱۴ ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو پھر دوبارہ قبضہ میں آگئی۔ آج کی لڑائی میں چھیاسٹھ ۶۶ افسر اور ۱۱۰۴ (گیارہ سو چار) آدمی مجروح و مقتول ہوئے۔ شہر فتح ہو گیا تھا۔ مگر پوری طرح سے قبضہ میں نہ آیا تھا۔ ہتھیار بند دشمن شہر میں موجود تھا اور اُس کے پاس توپیں بھی کافی تھیں۔ لیکن چونکہ انگریزوں کے پاس مضبوط مورچے آگئے تھے اس واسطے پندرہ۔ سولہ۔ سترہ۔ اٹھارہ ستمبر کی تاریخوں میں جنگ برابر جاری رہی لیکن ہر روز باغیوں کو شکست ہوتی تھی اور وہ آہستہ آہستہ مورچے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ آخر ۱۹ ر ستمبر تک تمام شہر قبضہ میں آگیا اور جنرل ولسن کو یقین ہوا کہ اب کچھ خطرہ باقی نہیں رہا اور میں واقعی دہلی شہر پر قابض ہو گیا ہوں:۔

بہادر شاہ بادشاہ کا گرفتار ہونا

لارڈ گورنر بخت خاں کی تقریر

جب ۱۹ ستمبر کی رات کو انگریزوں نے شہر کے بڑے حصّہ پر قبضہ کر لیا تو بہادر شاہ نے قلعہ سے نکل جانے کا ارادہ کیا، اس وقت باغیوں کا مشہور سپہ سالار محمد بخت خاں جو بریلی کا رہنے والا تھا اور جس کی دانشمندی اور فوجی کارگزاری بادشاہ اور تمام امرار اور فوجی افسروں میں بالاتفاق مانی جاتی تھی، اور جس کو بہادر شاہ کے مزاج میں اتنا دخل ہو گیا تھا کہ اس کی رائے کے بغیر بادشاہ کچھ کام نہ کرتے تھے اور اُس کو لارڈ گورنر کا خطاب دیا تھا، رات کے وقت بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کی، کہ اگرچہ انگریزوں نے دہلی شہر کو لے لیا ہے لیکن اس سے ہمارا کچھ بہت زیادہ نقصان نہیں ہوا، تمام ہندوستان ہمارے ساتھ ہے، اور ہر شخص کی نظر آپکی ذات اور آپکے حکم پر لگی ہوئی ہے، حضور کچھ تردد نہ فرمائیں، میرے ساتھ تشریف لے چلیں میں پہاڑوں میں بیٹھ کر ایسی زبردست مورچہ بندی کرونگا کہ انگریزوں کا فرشتہ بھی وہاں نہ آسکے گا، دہلی پایۂ تخت ہے، فوجی قلعہ نہیں ہے۔ لڑائیوں کے لئے ایسے مقامات مناسب نہیں ہوتے۔ چند مہینے جو ہم نے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور شہر کو بچائے رکھا یہ بھی کچھ معمولی بات نہیں ہے، ہمارا شہر نشیب میں تھا اور انگریز پہاڑی پر تھے، کوئی ناتجربہ کار فوج بھی پہاڑی جیسے مضبوط مورچہ پر ہوتی تو اس کو بھی دہلی کا فتح کر لینا کوئی دشوار نہ ہوتا۔ سب سے بڑی خرابی اس بات نے ڈالی کہ حضور کے صاحبزادے مرزا مغل بہادر فوج کے کمانڈر انچیف بنا دیے گئے۔ وہ لڑائی کے فن سے واقف نہ تھے، نہ اُن کو یہ معلوم تھا کہ خود سر اور سرکش فوجوں کو کن طریقوں

سے قابو میں لایا جاتا ہے اور اِن میں ضبطِ انتظام اور اطاعت مندی کن صورتوں سے جاری ہوتی ہے۔ میں نے زندگی کا بڑا حصہ فوجی کام میں صرف کیا تھا اگر میرزا مغل میرے منصوبوں میں رخنہ نہ ڈالتے اور جاجج نہوتے تو یقیناً اسی خود سر فوج سے انگریزوں کو شکست دیدیتا۔ ہمکو سب سے بڑی دشواری یہ درپیش تھی کہ رسد رسانی کا انتظام کرنے والا ہمارے ہاں کوئی نہ تھا، ملک میں ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ ہم سب اگر پوری یکدلی سے انگریزوں جیسے عاقل دشمن کا مقابلہ کرتے تو بے سروسامانی کے باوجود اس کو پہاڑی سے بھگادینا دشوار نہ تھا۔ مگر ہم کو آپس کے بگاڑ اور ایک دوسرے پر بھروسہ نہ کرنے کے سبب وہ قوتیں جو دشمنوں کے مقابلہ میں خرچ کرنی چاہئے تھیں خانگی جھگڑوں میں بیکار صرف کرنی پڑیں۔

مگر اب بھی کچھ نہیں گیا ہے اور مکرر عرض کرتا ہوں کہ کچھ بھی نہیں گیا ہے۔ تمام ہندوستانی ریاستیں اپنی اپنی جگہ پر غور سے چُپ چاپ بیٹھی دیکھ رہی ہیں کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے، جسوقت ہمارا پلہ ذرا بھی بھاری اور مضبوط ہو جائے گا وہ سب ہماری امداد کے لئے اُٹھ کھڑی ہوں گی، کیونکہ ہر ریاست کا دل انگریزوں سے پک گیا ہے اور وہ یقین کرنے لگی ہیں کہ انگریز رفتہ رفتہ ہندوستان کی ہر ریاست کو نگل لینا چاہتے ہیں۔ ان کو ہمیشہ بہانوں کی تلاش رہتی ہے جھانسی۔ ناگپور اور پونہ کی ریاستوں کا حال سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ انگریزوں نے کیسے عجیب مگر خلاف انصاف حیلوں اور بہانوں سے ان ریاستوں کو ضبط کرلیا۔

ہندوستان کے ہر باشندے کو اپنا مذہب عزیز ہے اور ہر شخص یقین کرتا ہے کہ انگریز ہمارے پیارے مذہب کو بھی ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں اور ان کی جگہ جبراً ہمارے گلوں میں عیسائی مذہب کا طوقِ غلامی ڈالدینا اُن کے مدنظر ہے۔ ایسی حالت میں آپ یقین کیجئے کہ اگر آپ محفوظ مقامات میں بیٹھکر انگریزوں کا مقابلہ کریں گے تو تمام ملک ہمارا ساتھ دے گا آدمی، رسد کا سامان اور روپیہ اور ہتھیار، لڑائی میں انہی چار کی ضرورت ہے اور یہ

چاروں ہم کو اس افراط سے مل سکتے ہیں کہ اگر انگریز اپنے ملک کے بچہ بچہ کو ہم پر چڑھا کر لے آئیں تب بھی ہم صدیوں تک ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور آج تو انکے مددگار ہمارے ہی ملکی بھائی ہیں جن کو بہکا سکھا کر اور لوٹ و انعام کے وعدے دیکر وہ سمیٹ لائے ہیں۔ کل جبوقت ہمارے پاؤں مضبوط ہو جائیں گے تو ہم بھی ان سے اُسی قسم کے وعدے کر سکیں گے جو انگریزوں نے ان سے کئے ہیں اور ہمارے ساتھ ملجانا انکا یقینی ہوگا۔

جہاں پناہ کے سامنے یہ عرض کرنا آفتاب کو شمع دکھانا ہے کہ حضور کے اجداد نے اس سے بڑھ بڑھ کر شکستوں اور ناکامیوں کا مقابلہ کیا ہے۔ شہنشاہ بابر بعض اوقات دشمنوں میں ایسے گھرے ہیں کہ تنہا بھاگنے کے سوا چارہ کار نہیں رہا تھا۔ شہنشاہ ہمایوں کیسی بے کسی اور بے بسی میں ایران بھاگ کر گئے تھے مگر ان کے استقلال نے تمام دشواریوں اور مشکلات کو فتح کر لیا جس کے بعد اُن کے خاندان نے اس سرزمین پر سینکڑوں برس حکومت کی۔ آپ بھی اُسی بزم عالم افروز کی شمع حقیقی ہیں اور آپکے ساتھ تو ملک کے بچہ بچہ کو ہمدردی ہے، تمام ہندوستان آپکے جھنڈے کے نیچے جمع ہو کر مرنے مارنے کو تیار ہے، اگر حضور میرے ساتھ تشریف لے چلیں تو چند روز میں ہر چیز کو درست کر لونگا، اور ظل سبحانی کو ہر فکر اور تکلیف سے محفوظ رکھونگا۔

بادشاہ بخت خاں کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا ہم ہمایوں کے مقبرے جاتے ہیں، تم کل صبح وہاں آؤ اور ہم سے ملو، اُس وقت تمام اُمور کا فیصلہ ہو جائے گا۔

میرزا الٰہی بخش کی تقریر

اِدھر تو یہ ہو رہا تھا اُدھر میرزا الٰہی بخش انگریزوں کی طرف سے اس بات پر مامور کئے گئے تھے کہ کسی طرح بادشاہ کو باغیوں کے ساتھ نہ جانے دیں منشی رجب علی جو انگریزی کیمپ میں مخبری کے دفتر کے سر دفتر تھے اور ہڈسن صاحب کی ناک کا

بال بنے ہوئے تھے وہ برابر میرزا الٰہی بخش کو پیغام بھیج رہے تھے کہ اگر تم نے بادشاہ کو باغیوں کے ساتھ جانے سے روک لیا تو انگریز تم کو نہال کر دیں گے۔ اور ساری عمر تم کو اور تمھاری اولاد کو اپنے انعامات سے شاہانہ زندگی بسر کرائینگے (انگریزوں نے یہ وعدہ پورا کیا۔ بارہ سو روپے ماہوار پنشن ان کی اولاد کو ملتی ہے)

جس وقت بخت خاں بادشاہ سے ملاقات کر کے چلا گیا تو مرزا الٰہی بخش بادشاہ کے سامنے آئے اور عرض کیا کہ "لارڈ گورنر بخت خاں بہادر نے جو کچھ حضور عالی کے سامنے گزارش کیا ہے فدوی کو اُس کے حرف حرف سے اتفاق ہے، مگر مجھے ایک ضرور معاملہ گوش گزار کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ آیا یہ لڑائی حضور سے ہے یا باغی فوج سے؟ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں کی فوج اُن سے باغی ہو گئی اور سرکشی کر کے آپکے پاس آ گئی، آپ مجبور تھے۔ آپ کے پاس طاقت نہ تھی جو اُن کو اپنے پاس نہ آنے دیتے، انگریز اندھے نہیں ہیں، وہ آپ کی مجبوری کو اچھی طرح جانتے ہیں، اُن کو معلوم ہے کہ آپ کے نام سے باغیوں نے جسقدر کام کئے ہیں اور جیسے جیسے حکم احکام جاری کرائے ہیں اُن میں سے ایک میں بھی آپ کا دخل نہیں ہے، پھر آپ کو کس بات کا اندیشہ ہے فکر نہ کرنا چاہئے۔ البتہ اگر آپ باغیوں کے ساتھ چلے گئے۔ تب بیشک انگریز آپ سے بازپرس کریں گے اور آپ کو مجرم قرار دینے کا ایک بہانہ اُن کو مل جائیگا۔ مجھ کو ذرا بھی یقین نہیں ہے کہ باغی کسی جگہ جم کر مقابلہ کر سکیں گے بخت خاں بہادر نے جو کچھ کہا اُس کو تو میں لفظاً لفظاً مانتا ہوں، بیشک ہندوستان کی ریاستیں اور ہندو مسلمان دل سے آپ کے ساتھ ہیں۔ لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ باغی فوج آپ کے یا بخت خاں کے قابو میں رہے گی، جو فوج ایک ایسے آقا کے قبضہ میں نہ رہ سکی جس کے پاس روپیہ، علم اور ہنر اور سب سے بڑی دولت عقل بخت خاں سے کہیں زیادہ تھی تو پھر اکیلے بخت خاں بیچارے کیونکر ایسی

خود سر اور بے مہار فوج کو مطیع کر سکیں گے۔

گرمی کا موسم ہے، برسات آگئی ہے، حضور کی ضعیفی اور ناتوانی کا زمانہ ہو گھر سے باہر نکلکر مسافرت میں امن بھی ہو تب بھی گھر کا سا آرام میسر آنا محال ہوتا ہے اور لڑائی بھڑائی کی حالت میں تو لازمی طور سے بڑی بڑی تکلیفوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آپ چھوٹے چھوٹے شہزادوں، شہزادیوں اور پردہ نشین بیگمات، کو کہاں لیئے لئے پھرینگے۔ لہذا میری گذارش تو یہی ہے کہ آپ باغیوں کے ساتھ تشریف نہ لیجائیں، میں انگریزوں سے ملکر تمام معاملات کی صفائی کرادونگا اور آپ پر، آپ کی اولاد پر ایک حرف نہ آنے دونگا۔ سلطنت کا انجام جو کچھ ہو آپ کی بلاؤ کی رکابی کہیں نہیں جائے گی۔"

مرزا الٰہی بخش کی یہ تقریر سُنکر بادشاہ چُپ ہو گئے، کچھ جواب نہ دیا۔ البتہ جب ایک خواجہ سرا نے عرض کیا کہ "حضور صاحب عالم بہادر تو انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں، آپ بخت خاں بہادر کی گزارش پر توجہ فرمائیے، ان لوگوں کے کہنے میں نہ آئیے، مرنا اور تکلیف اُٹھانا تو ہر زندگی کے ساتھ لگا ہوا ہے" تو بادشاہ نے فرمایا میں دونوں باتوں پر غور کر کے کل جواب دونگا۔

دوسرے دن بادشاہ اور اُن کی بیگمات قلعہ سے روانہ ہو کر ہمایوں کے مقبرہ میں آئے، بادشاہ نے عورتوں اور بچوں کو تو ہمایوں کے مقبرے میں بھیجا، اور خود درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ میں جاکر پہلے سلام کیا اور پھر مقبرہ میں واپس آگئے، مرزا الٰہی بخش نے تمام کیفیت منشی رجب علی کے ذریعہ سے ہڈسن صاحب کو بھیجدی تھی، اور لکھدیا تھا کہ بظاہر میں نے بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روک لیا ہے اور کل دوبارہ مقبرۂ ہمایوں میں ملنے کا وعدہ ہوا ہے۔ اس لئے آپ کچھ فوج لیکر مقبرہ کے غربی دروازہ کی طرف سے آجائیے کیونکہ بخت خاں شرقی

دروازہ سے مقبرہ کے اندر آئیگا، اُس کی فوج دریا کی ریتی میں پڑی ہوئی ہے۔ جس وقت بخت خاں رخصت ہو کر جائے آپ فوراً اندر آکر بادشاہ کو گرفتار کر لیجئے۔

ہڈسن صاحب نے اس خبر کی اطلاع جنرل ولسن کو دی اور اس کے ساتھ ہی منشی رجب علی کو حکم بھیجا کہ تم مرزا الٰہی بخش کو اطلاع دیدو کہ وہ جہانتک ہو سکے بادشاہ کو بخت خاں کے ساتھ نہ جانے دیں اور جب بخت خاں چلا جائے تو ۲۴ گھنٹے تک بادشاہ کو مقبرے میں روکے رکھیں۔ اس کے بعد سب انتظام ہو جائے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جبوقت بخت خاں مقبرۂ ہمایوں میں بادشاہ کے پاس آیا تو بڑی دیر تک حجت بازی رہی، بادشاہ جانا چاہتے تھے، بخت خاں لیجانا چاہتا تھا، اور میرزا الٰہی بخش روکتے تھے۔ بخت خاں اور میرزا الٰہی بخش کی بھی آپس میں کچھ تیز و ترش گفتگو ہوئی۔ مرزا الٰہی بخش نے کہا۔" لارڈ گورنر صاحب! کل آپنے فرمایا تھا کہ میں حضور کو ہر تکلیف و فکر سے محفوظ رکھونگا، تو کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ جہاں پناہ کے نام کی آڑ میں آپ خود حکومت کرنا چاہتے ہیں ظلِ سبحانی کو اس سخت موسم اور اس بڑھاپے کی حالت میں آپ کیا محض اس وجہ سے لیجاتے ہیں کہ ہندوستان کی بادشاہی آپ کو مل جائے اور صدیوں کا انتقام مغلوں سے لیا جائے جنھوں نے پٹھانوں کی سلطنت تلوار کے زور سے چھینی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ آپ بھی پٹھان ہیں اور پٹھان سینکڑوں برس تک کینہ کو نہیں بھولتے"۔

مرزا صاحب کی یہ بات سُنکر بخت خاں اس قدر بگڑا کہ قریب تھا مرزا صاحب کو ہلاک کر دے مگر بادشاہ نے اُس کو روکا اور فرمایا۔" بہادر! مجھے تیری ہر بات کا یقین ہے اور میں تیری ہر رائے کو دل سے پسند کرتا ہوں، مگر جسم کی قوت نے جواب دیدیا ہے۔ اس لئے میں اپنا معاملہ تقدیر کے حوالہ کرتا ہوں۔ مجکو میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور بسم اللہ کرو۔ یہاں سے جاؤ اور کچھ کام کرکے دکھاؤ۔ میں نہیں،

میرے خاندان میں سے نہیں، نہ سہی، تم یا اور کوئی ہندوستان کی لاج رکھے، ہمارا فکر نہ کرو، اپنے فرض کو انجام دو۔"

بخت خاں اس جواب سے مایوس ہو گیا اور ہونٹ چباتا ہوا مقبرہ کے مشرقی دروازے سے دریا کی طرف اُتر گیا، اور فوج کو ساتھ لے کر ایسی جگہ غائب ہوا جہاں آج تک کوئی نہ پہنچ سکا۔ وہ ایسا عاقل آدمی تھا اور اُس کی فوج اُس کی ایسی اطاعت گذار تھی کہ جب سے اُس نے فوج سمیت بغاوت کی تھی اور دہلی میں آیا تھا اُس وقت سے دہلی کی شکست تک کبھی اُس کا یا اُس کی فوج کا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ دہلی نے چند مہینے تک جو مقابلہ کیا وہ اسی کی حسن تدبیر کا نتیجہ تھا ورنہ باغی فوجیں ایسی ابتری کی حالت میں تھیں کہ دو دن بھی مقابلہ نہ کر سکتیں۔

بہادر شاہ سے رخصت ہونے کے بعد بھی اس کی عقل نے اس کا ساتھ دیا اور وہ ایسا روپوش ہوا کہ انگریزوں کے انتقام سے خود بھی بچا رہا اور اُس کی فوج کا ہر ایک آدمی بھی محفوظ رہا، حالانکہ بغاوت کا وہی سب سے بڑا سرغنہ اور پیشوا تھا۔ قسمت نے بخت خاں کو ناکام رکھا ورنہ عجب نہیں تھا کہ وہ ہندوستان کا تاجدار بنجاتا۔ اور انگریزوں کو ملک سے خارج کرنے کے بعد تیموریوں کی کمزور ہستی کو بھی درمیان سے دور کر دیتا اور دوسرا شیر شاہ تاریخوں میں لکھا جاتا۔

میجر ہڈسن کو میرزا الٰہی بخش کے ذریعہ سے خبر پہنچی کہ باغی فوج بادشاہ کو ساتھ لیجانے میں کامیاب نہیں ہوئی اور اب بادشاہ کا مقبرہ میں کوئی مخدوش حمایتی باقی نہیں رہا ہے تو اُنھوں نے جنرل ولسن سے اجازت مانگی کہ میں وہاں جا کر بادشاہ کو گرفتار کر لاؤں۔ جنرل نے اجازت دی، مگر اُس وقت افسروں میں یہ بحث ہونے لگی کہ بادشاہ کو زندہ لایا جائے یا قتل کر دیا جائے؟ جنرل ولسن کہتا تھا، اُس کو قتل کر دینا چاہیئے۔ مگر دوسرے افسر اس کے خلاف تھے، آخر جنرل نے بھی مان لیا کہ

بادشاہ کو قتل نہ کیا جائے، کیونکہ ابھی صرف دہلی قبضہ میں آئی تھی باقی تمام ہندوستان بغاوت کی آگ سے گرم ہو رہا تھا اس لئے مصلحت یہ تھی کہ بادشاہ کو زندہ رکھا جائے

میجر ہڈسن ۵۰ سوار لیکر مقبرۂ ہمایوں کے مغربی دروازہ پر آیا، اور وہیں باہر کھڑا رہا اور اندر بادشاہ کو اطلاع بھیجی کہ میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں آپ آئیے تاکہ میں اپنے ہمراہ لے جاؤں۔

ہڈسن صاحب بہت سنگدل اور سخت آدمی تھے، ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے کہ "میدان جنگ اُن کا ناچ گھر تھا، جنگی نفیری کے سوا ان کو کسی موسیقی اور نغمہ کا شوق نہ تھا۔ انسان کی کوئی مصیبت ان کے دل پر اثر نہ کرتی تھی۔ کسی کی خوں ریزی سے ان کو رنج و افسوس نہ ہوتا تھا، اور وہ آدمی کے مار ڈالنے کو تنکے کے توڑ ڈالنے سے کچھ زیادہ نہ سمجھتے تھے۔ بھاگتے اور پناہ مانگتے ہوئے آدمیوں کو بے تحاشا قتل کرنا اور اُن کے اسباب کو لوٹنا اُن کی دلی مسرت و شادمانی کے کام تھے غدر ۱۸۵۷ء کے وقت دہلی شہر میں جو مظالم ان کے ہاتھ سے ہوئے وہ ان کی ذاتی خصلت کا نمونہ تھے، برٹش خصائل کو ان سے تعلق نہ تھا"

اس سنگ دلی کے باوجود انھوں نے بڑی مہربانی کی کہ مقبرہ کے باہر کھڑے رہے اور بادشاہ کے زنانہ میں بے دھڑک نہیں گھُسے، مگر اس مہربانی کا باعث ممکن ہے یہ بھی ہو کہ وہ باغی فوج کی موجودگی سے خائف ہوں اور اُن کو اندیشہ ہو کہ اندر بخت خاں کے آدمی پوشیدہ بیٹھے ہوں گے۔

بہرحال جس وقت ہڈسن صاحب کا پیغام بادشاہ کو پہنچا اُنھوں نے میرزا الٰہی بخش کو گھور کر دیکھا اور کہا "تم نے مجکو بخت خاں کے ساتھ جانے سے روکا، اگر انگریزوں کو مجھ سے کچھ سروکار نہیں تھا جیساکہ تم نے بیان کیا تھا تو پھر مجکو وہ گرفتار کرنے کیوں آئے ہیں؟" مرزا الٰہی بخش سر جھکائے خاموش کھڑے رہے۔ اور

بادشاہ نے پھر ارادہ کیا کہ کسی کو بھیجکر بخت خاں کو بُلایا جائے، مگر انگریزوں کے ہمدردوں نے زینت محل بیگم کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا، اُنھوں نے بادشاہ سے کہا کہ اب بخت خاں کے بُلانے کا موقع نہیں رہا، معلوم نہیں وہ ملے یا نہ ملے اور ملے تو کیا خبر ہے کہ یہاں کس قدر کشت و خون ہو۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ آپ پہلے میجر ہڈسن سے اپنی اور میری اور جواں بخت کی جان کی امان طلب کیجئے، اور جب تک وہ اس کا وعدہ نہ کرے اُس کے پاس نہ جائیے۔

بادشاہ نے زینت محل کے کہنے کے بموجب ہڈسن کو پیغام بھیجا کہ میں اس شرط پر اپنے تئیں حوالہ کر سکتا ہوں کہ میری جان اور میری بیوی بچوں کی جان محفوظ رکھی جائے۔

ہڈسن صاحب نے اس شرط کو قبول کر لیا۔ اور پورے دو گھنٹے اس حیص بیص میں صرف کرنے کے بعد بادشاہ مقبرہ سے باہر تشریف لائے، زینت محل بیگم و شہزادہ جواں بخت پالکیوں میں سوار پیچھے تھے اور بادشاہ چند خواجہ سراؤں کے ساتھ پیدل آگے تھے۔

عبرتناک منظر

میجر ہڈسن نے اپنے سواروں کو کھنڈروں اور قبروں کی آڑ میں کھڑا کر دیا تھا اور خود دو تین گوروں کے ساتھ اکیلے سامنے کھڑے تھے، جوں ہی بادشاہ کی نظر ہڈسن پر اور ہڈسن کی نگاہ بادشاہ پر پڑی۔ ایک عجیب عبرت خیز نظارہ پیش آیا۔ وہ بادشاہ جو گورنر جنرل سے بھی بڑی تمکنت کے ساتھ بات کرتا تھا اور جس کو کسی معمولی درجہ کے انگریز کا بغیر خاص مراسم آداب ادا کرنے کے سامنے بلانا گوارا نہ تھا، آج وہ خود ایک معمولی خفیہ پولیس کے افسر کے سامنے آیا، اور کہا:۔ "کیا تم ہی ہڈسن ہو؟" ہڈسن نے کہا:۔ "ہاں میرا نام ہڈسن ہے۔" بادشاہ نے کہا:۔ "اگر تم ہڈسن ہو

ہو تو میں اس وقت تمھاری زبان سے بھی اس فقرہ کو سُننا چاہتا ہوں، جو تم نے ابھی مقبرہ کے اندر مجکو کہلا بھیجا تھا۔ یعنی "تم میری جان اور میری بیوی زینت محل اور لڑکے جواں بخت کی جان کے ذمہ دار ہو"

ہڈسن صاحب نے باوجود سخت مزاجی کے نرمی سے جواب دیا۔ "آپ اطمینان رکھئے آپ کی اور زینت محل بیگم اور جواں بخت کی جان کو کچھ خطرہ نہیں ہے۔"

اس کے بعد پالکی لائی گئی اور بادشاہ کو اُس میں سوار کیا گیا اور سواروں کے محاصرہ میں بادشاہ اور اُن کی بیگم اور لڑکے کو لیکر ہڈسن صاحب روانہ ہو گئے۔

لارڈ کرزن کے دربار دہلی کے موقع پر نمائش گاہ میں اُس وقت کی ایک قلمی تصویر رکھی گئی تھی جس کو دیکھ کر میں نے ایک مضمون لکھا تھا جو غدر دہلی کے افسانوں کے پہلے حصّہ میں چھپا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کو یہاں نقل کیا جائے کہ اس کے قلمی اثر اور بیانِ ہذا کے سادہ اثر کو ناظرین ملا کر دیکھیں اور اُن کو انقلابات ایام کا تماشہ اچھی طرح نظر آسکے۔ وہ مضمون یہ ہے:۔

غدر کی تصویر

اللہ اللہ زمانہ کے نشیب و فراز میں کتنے پُرحسرت نظارے ہیں۔ یہی دہلی جو اپنی گود میں ہزاروں ارمان بھرے دلوں کا خون بہتا دیکھ چکی ہے، رہ رہ کے پلٹا کھاتی اور رنگ دکھاتی ہے، ایک دن وہ تھا کہ بابر کی تلوار نے ابراہیم لودھی کا خون دہلی کے ریگستان کو پلایا اور اُس کے اہل و عیال کو حسرت و یاس کی مجسّم تصویر بنا ہوا سامنے دست بستہ کھڑا ہوا دیکھا یا ایک دن ایسا آیا کہ اُسی کی اولاد اپنے اعمال کی بدولت ان بیکیوں کا نمونہ بنی۔

آہ! دہلی دربار کی نمائش گاہ میں داخل ہوتے ہی ایک تصویر نظر پڑی جس میں

بزم تیموری کی گل ہونے والی شمع ابوظفر بہادر شاہ مقبرہ ہمایوں میں میجر ہڈسن کے ہاتھوں گرفتار کیے جا رہے ہیں۔ پشت پر ہمایوں کا مقبرہ نظر آتا ہے۔ جس پر کچھ عجیب دلگیر افسردگی چھائی ہوئی ہے۔ بہادر شاہ عبا پہنے ہوئے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں عصا ہے، چہرہ غم و الم میں ڈوبا ہوا، بڑھاپے کا رنگ اور متحملانہ یاس کا عالم ہے۔ میجر ہڈسن سرخ وردی پہنے بادشاہ کا دامن پکڑے کھڑے ہیں اور اُن کے دو ہمراہی بادشاہ کی پشت پر نظر آتے ہیں۔ میجر ہڈسن کی اس بے باکانہ جرأت پر بادشاہ کا ایک بوڑھا جاں نثار تلوار سوت کر لپکتا ہے، ہاتھ میں ڈھال ہے اور لشرو نڈھال، قریب پہنچتے پہنچتے برابر والا سوبجر پستول سامنے کر کے اسکا بڑھا ہوا حوصلہ پست، اور جوش انتقام سرد کر دیتا ہے۔

افسوس ہے کہ دنیا کے اس مصیبت خیز انجام پر بھی لوگوں کو اس کی ہوس باقی ہے۔ نمائش سے چلتے وقت میں دیوانِ حافظ کا خود بخود کھلا ہوا ایک ورق نظر پڑا جس کی پہلی سطر تھی:۔

آخر نظرے لبوئے ما کن   اے دولتِ خاص و حسرتِ عام

یہ پڑھتا ہوا باہر آیا اور اس مرقع کو مخاطب کر کے اس شعر کو دوہراتا رہا۔

اس تصویر میں ہڈسن صاحب کا عبا کے دامن کو پکڑنا اور ایک جاں نثار کا حملہ کرنا محض مصوری کی خیالی داستان ہے، واقعات سے کچھ تعلق نہیں۔ البتہ نمائش گاہ میں اُسی وقت دیوانِ حافظ کا نظر آجانا اور اُس میں یہی شعر دکھائی دینا ایک خاص اثر کا واقعہ ہے۔ بے شک بہادر شاہ اُس وقت انگریزوں کے لئے تو دولتِ خاص تھے، اور ہندوستان کے واسطے حسرتِ عام۔

ہڈسن کی نیت

اس موقع پر یہ لکھنا تاریخی اطلاع دینا ہے کہ جنرل ولسن کی طرح میجر ہڈسن بھی بہادر شاہ کو قتل کر دینا چاہتے

تھے اور اُنھوں نے دیگر انگریز افسروں کی مجبوری سے بادلِ ناخواستہ بادشاہ سے جان کی امان کا وعدہ کرلیا تھا، ورنہ نیت ان کی یہی تھی کہ بادشاہ کو قتل کردیا جائے۔ چنانچہ اس دن کی ذاتی ڈائری میں میجر ہڈسن نے لکھا ہے کہ "میں دہلی کے بادشاہ کو مُردہ لانا بہ نسبت زندہ لانے کے زیادہ پسند کرتا تھا۔"

لطف کی بات یہ ہے کہ اسی یادداشت میں ہڈسن نے یہ فقرہ بھی لکھا ہے کہ "بہادر شاہ بغاوت میں عملی حصہ لینے سے بری تھے۔"

قصہ مختصر ہڈسن، بادشاہ، اُن کی بیگم اور جوان بخت کو لیکر آہستہ آہستہ شہر کے لاہوری دروازہ کی طرف سے گئے، اور چاندنی چوک کے بازار میں ہوکر لال قلعہ کے اندر لائے اور وہاں زینت محل کے مکان میں اُن کو مقید کردیا۔

لاہوری دروازہ سے لانے اور تمام چاندنی چوک کو عبور کرانے کی وجہ یہ تھی کہ کُل شہر کو بادشاہ کے گرفتار ہوجانے کی اطلاع ہوجائے۔

قلعہ میں پہنچکر بادشاہ نے خواہش کی کہ جنرل ولسن کو میرے پاس بلایا جائے میں اُس سے ملنا چاہتا ہوں۔ جنرل ولسن نے یہ پیغام سُنکر جواب دیا "مجھ کو اُن سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے اور میں اُن سے ملنا نہیں چاہتا۔" اس انکار کے بعد جنرل ولسن نے اپنے ایڈی کانگ لفٹننٹ ٹرنیل کو بادشاہ کے پاس بھیجا۔ جس نے گورے سپاہیوں کا پہرہ بادشاہ کے مکان پر لگادیا۔

چشمِ تصوّر

اگرچہ بہادر شاہ اور اُن کے باپ اکبر شاہ اور اُن کے باپ شاہ عالم ایک اعتبار سے برٹش گورنمنٹ کے قیدی تھے اور اُن کو قید کی عادت پڑگئی تھی۔ پھر بھی آج کی رات جبکہ وہ اپنے ہی قلعہ میں قید کئے گئے تھے۔ ان کے دل کی کیا حالت ہوگی، اور ان کی

پیاری بیوی زینت محل اور نوعمر شہزادہ جواں بخت کا کیا عالم ہوگا۔

تصور کی آنکھ کے سوا کوئی اور ذریعہ قیدیوں کے قلبی احساس اور پہلی رات کی غمگینی کا منظر اصلی طور سے نہیں دکھا سکتا۔ ان کو باوجود ہڈسن کے اقرار کے اپنی زندگی کے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہوگا، وہ اپنی راحت و عیش اور حکومت کے رہے سہے نام ونشان کو آج کی رات ختم شدہ خیال کرکے دل ہی دل میں آخری چراغ کی طرح مایوسی کی ہوا سے جھلملا رہے ہوں گے اور غم کی شدت سے کلیجہ اُن کے مُنہ کو آرہا ہوگا۔ کوئی چیز اُن کے سینہ کی طرف سے اُٹھتی ہوگی اور اُس کا دھواں دماغ کی طرف چڑھ کر اُن کو جاں کنی کا مزا چکھاتا ہوگا۔

اُن کو اپنے باقی ماندہ بچوں اور رعایا کا خیال بھی بے چین کر رہا ہوگا جن کی امداد و ہمدردی کا اس عالمِ اسیری میں اب کوئی سامان اُن کے پاس باقی نہ رہا تھا۔ تصور کی آنکھ جب یہ دیکھتی ہے تو اُس کا بُرا حال ہو جاتا ہے۔

بادشاہ کے بیٹوں کا قتل

منشی ذکاء اللہ صاحب کا بیان ہے کہ "بادشاہ کی گرفتاری کے دوسرے دن منشی رجب علی اور میرزا الٰہی بخش نے خبر دی کہ میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان اور میرزا ابو بکر بادشاہ کے دو بیٹے اور ایک پوتے بھی مقبرۂ ہمایوں میں موجود ہیں، اور یہ وہی ہیں جنھوں نے قلعہ میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ میجر ہڈسن کا خون اس خبر سے جوش میں آگیا اور وہ جنرل ولسن سے اجازت لے کر شہزادوں کے قتل کے لئے روانہ ہوا۔ میکڈانلڈ صاحب بھی ہڈسن کے ہمراہ تھے۔ آج ہڈسن نے ۵ سواروں کی جگہ ایک سو سوار ہمراہ لئے تھے، اور منشی رجب علی اور میرزا الٰہی بخش دونوں جاسوس بھی ساتھ تھے۔

تینوں شہزادے میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان اور میرزا ابو بکر مقبرے کے اندر تھے، ہڈسن باہر کھڑا ہو گیا اور شہزادوں کو اطلاع بھیجی کہ میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں، مگر چونکہ شہزادوں کے ساتھ بہت سے جنگجو آدمی بھی تھے۔ اس لئے وہ جمعیت بھی زیادہ لایا تھا، اور اندر جانے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا۔

شہزادوں نے اپنے باپ کی طرح دو گھنٹے تک یہی حجت کی کہ اگر ہماری جانوں کی ذمہ داری کی جائے تو ہم اپنے تئیں حوالہ کر سکتے ہیں، ورنہ نہیں۔ میجر ہڈسن نے جواب دیا کہ میں آپ کی جانوں کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں جنرل ولسن کے ماتحت ہوں اور مجھے ان معاملات کے اختیارات نہیں ہیں۔ بہادر شاہ سے تو میں نے اس وجہ سے اقرار کر لیا تھا کہ جنرل ولسن نے مجکو اس اقرار کی اجازت دیدی تھی، شہزادوں کو بلا کسی شرط کے میرے پاس آجانا چاہئے اس کے بعد دیکھا جائے گا، جنرل ولسن کے ہاتھ سب کچھ اختیار ہے۔

شہزادوں نے یہ جواب سُنکر اپنے رفیقوں سے صلاح لی اور اُن سب نے کہا کہ "تیموری خاندان کے لوگ اس طرح مجبور ہو کر قید نہیں ہوا کرتے، تلوار اُٹھاتے ہیں اور لڑتے ہیں۔ پھر یا قسمت یا نصیب کا معاملہ ہوتا ہے۔ دارا شکوہ کو جب اورنگ زیب نے قتل کرانا چاہا اور قاتل قید خانہ میں آئے تو دارا ترکاری چھیلنے کی چھُری لے کر کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر اپنے قاتلوں کا مقابلہ کرتا رہا۔ ہم کو بھی دلیرانہ کام کرنا چاہئے۔ ہڈسن اور اُس کے سو سواروں کو ہم تھوڑی دیر میں شکست دے سکتے ہیں، اوّل مرنا آخر مرنا۔ مرنا تو ہر حال میں ہے، پھر بہادری کی موت کیوں نہ مریں۔"

شہزادوں نے بھی اس تجویز کو پسند کیا، مگر میرزا الٰہی بخش نے پھر نصیحت کا دفتر کھولدیا اور ایسے اُتار چڑھاؤ شہزادوں کو دیے کہ وہ بچارے لڑنے کے خیال سے

دست بردار ہو گئے اور میرزا الٰہی بخش کے ہمدردانہ مشورہ کے موافق تن بہ تقدیر بلا کسی شرط کے ہڈسن کے پاس چلا جانا قبول کر لیا اور اپنے رفیقوں کو مقبرہ کے اندر رخصت کر کے ہڈسن کے پاس چلے آئے۔

جس وقت شہزادے ہڈسن کے سامنے آئے۔ اُس نے ان کو خونخوار نظروں سے دیکھا مگر خاموش کھڑا رہا، اور رتھوں میں سوار ہو جانے کا حکم دیا۔ شہزادے سوار ہو گئے تو ہڈسن ان کو محاصرہ میں لیکر دہلی کی طرف روانہ ہوا اور جب دہلی ایک میل رہ گئی تو رتھوں کو ٹھہرایا۔ اور شہزادوں کو حکم دیا کہ رتھوں سے باہر آ جائیں اور اپنے کپڑے اُتار ڈالیں، شہزادوں نے یہ حکم سُن کر آپس میں ایک دوسرے کو دیکھا اُن کو یہ اُمید ہرگز نہ تھی کہ ان کو اسی جگہ قتل کیا جائے گا، کیونکہ مرزا الٰہی بخش نے ان سے کہا تھا کہ جنرل ولسن کے اختیار میں یہ فیصلہ ہے اور جنرل سے جس وقت سفارش کی جائے گی تو وہ بادشاہ کی طرح ہم کو بھی جان کی امان دیدے گا۔ ہڈسن صاحب کو نہ امان دینے کا اختیار ہے نہ قتل کرنے کا۔ مگر جس وقت کہ ہڈسن نے ان کو رتھوں سے باہر آنے اور کپڑے اُتارنے کا حکم دیا تو وہ اس کی وجہ کو بالکل نہیں سمجھے اور ایک دوسرے کو حیرت اور تعجب سے دیکھنے لگے۔

آخر وہ رتھوں سے اُترے اور اُنھوں نے اوپر کے لباس شہزادگی کو جسم سے جُدا کر دیا۔ اور ہڈسن کو دیکھنے لگے کہ اب کیا کہنا چاہتا ہے، اُن کو خیال تھا کہ شاید یہاں سے وہ ہم کو مقید کر کے پیدل لے جانا چاہتا ہے، یہ بات تو اُن کے خواب وخیال میں بھی نہ تھی کہ ہم اسی جگہ قتل کئے جائیں گے۔

ہڈسن نے جب ان کو لباس شہزادگی اُتارے ہوئے کھڑا دیکھا تو وہ غصہ سے دیوانہ ہو گیا اور اُس نے ایک سوار سے بھری ہوئی قرابین مانگی اور اُس کو ہاتھ میں لیکر تڑ تڑ تین فیر کئے۔ گولیاں شہزادوں کے سینے میں لگیں اور وہ ہائے دھوکہ

کھکر زمین پر گر پڑے، اور خاک میں لوٹنے لگے اور کچھ دیر کے بعد مر گئے۔

ہڈسن ان کے تڑپنے اور خاک و خون میں لوٹنے کو خوشی کے چہرے سے کھڑا ہوا دیکھتا رہا اور جب وہ مر گئے تو اُن کی لاشوں کو لیکر کوتوالی پر آیا اور لاشوں کو ایک رات دن سر بازار لٹکائے رکھا۔

ہڈسن نے شہزادوں کا خون پیا

جوان بیٹوں کے کٹے ہوئے سر بوڑھے باپ کی نذر کئے گئے

ایک روایت تو شہزادوں کے قتل کی یہ تھی جسکو منشی ذکاء اللہ نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے اور دوسری روایت اور ہے جو دہلی میں عام طور سے مشہور تھی اور میرزا الٰہی بخش کے ایک مصاحب خاص نے جو موقع پر خود موجود تھا میرے والد سے اس کو بیان کیا تھا اور والد نے اس قصہ کو میرے سامنے کہا، اور صرف ایک ہی روایت نہیں، میں نے صد ہا آدمیوں کی زبانی ایک ہی شان سے یہ واقعہ سُنا ہے، اور کسی بیان میں اختلاف نہیں پایا جاتا، اس واسطے میں اس روایت کو بھی درج کرتا ہوں۔

منشی ذکاء اللہ صاحب نے بھی اس روایت کو اپنی تاریخ کے صفحہ ۵۰۷ پر لکھا ہے، مگر ایک لفظ یہ بڑھا دیا ہے کہ واقعہ غلط ہے۔ یعنی وہ اس کو تو تسلیم کرتے ہیں کہ شہزادوں کے قتل کا واقعہ دہلی میں اس طرح مشہور تھا مگر وہ اسکو صحیح نہیں مانتے۔

وہ روایت جو شہزادوں کے قتل کی نسبت دہلی میں مشہور ہے اور جسکو منشی ذکاء اللہ نے غلط ٹھہرایا ہے اور جس کی روایت میرزا الٰہی بخش کے ایک مصاحب

شہزادہ میرزا مغل
غدر سنہ ۱۸۵۷ء میں باغی
فوج کے سپہ سالار۔
جو غدر میں
میجر ہڈسن کے ہاتھ
سے مارے گئے۔

نے میرے والد سے بیان کی تھی کہ میرزا مغل اور میرزا خضر سلطان اور میرزا ابوبکر بھی بہادر شاہ کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے اور جب قیدی موجودہ جیل خانہ کے قریب پہنچے تو ہڈسن صاحب نے بادشاہ اور زینت محل اور جواں بخت کی پالکیوں کو ایک طرف ٹھہرادیا۔ اور میرزا مغل، اور میرزا خضر سلطان، میرزا ابوبکر اور میرزا عبداللہ چار شہزادوں کو رتھوں سے اُتارا اور اپنے ہاتھ سے اُن کو قتل کرکے ایک چلّو خون کا پیا، اور کہا کہ اگر میں ان کا خون نہ پیتا تو میرا دماغ خراب ہوجاتا۔ کیونکہ ان لوگوں نے میری قوم کی بے کس عورتوں اور بچوں کے قتل میں حصّہ لیا تھا، اور ان کے دیکھنے سے میرا خون جوش کھاتا تھا۔

شہزادوں کے قتل کے بعد ان کے سر کاٹے گئے اور سروں کو بادشاہ کے سامنے لایا گیا اور ہڈسن نے کہا۔ یہ آپ کی نذر ہے جو بند ہو گئی تھی اور جسکو جاری کرانے کے لئے آپ نے غدر میں شرکت کی تھی۔ بہادر شاہ نے جوان بیٹوں اور جوان پوتے کے کٹے ہوئے سر دیکھے تو حیرت انگیز استقلال سے اُن کو دیکھ کر منہ پھیر لیا اور کہا الحمدللہ تیمور کی اولاد ایسی ہی سُرخرو ہوکر باپ کے سامنے آیا کرتی تھی۔ اس کے بعد شہزادوں کی لاشیں کوتوالی کے سامنے لٹکائی گئیں اور سر جیلخانہ کے سامنے خونی دروازہ پر لٹکادیے گئے جن کو ہزاروں آدمیوں نے دیکھا۔

یہ وہی دروازہ ہے جس پر دارا کا سر بھی لٹکایا گیا تھا اور عبدالرحیم خاں خانخاناں کے لڑکوں کے سر بھی لٹکائے گئے تھے۔ اور اسی وجہ سے اب تک اس کو دہلی والے خونی دروازہ کہتے ہیں۔ اس دروازہ کی دیوار خارا کے پتھروں کی ہے اور خارا میں لوہے کا اثر ہوتا ہے جو برسات میں اپنا سُرخ رنگ بہایا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کی دیوار پر اب تک سُرخ دھبے پڑے نظر آتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر عوام کہتے ہیں کہ یہ شہزادوں کے خون کا نشان ہے، جس کو خدا نے قیامت تک کے لئے محفوظ رکھا ہے

لارڈ رابرٹس جو بعد میں ہندوستان کے کمانڈر انچیف ہوئے اور جن کا جنگ یورپ کے زمانہ میں انتقال ہوا اور جو غدر ۱۸۵۷ء میں خود موجود تھے، میجر ہڈسن کے اس فعل کی نسبت لکھتے ہیں :-

"ہڈسن نے یہ کام کر کے اپنی نیک نامی میں بٹّہ لگا لیا۔ اُس نے شہزادوں کو بے ضرورت مار ڈالا"

اس روایت کی نسبت کہ ہڈسن نے شہزادوں کا خون پیا۔ سوائے زبانی حکایتوں کے اور کوئی تاریخی سند میری نظر سے نہیں گزری لیکن یہ خیال ضرور ہوتا ہے کہ جب بہادر شاہ گرفتار ہوئے تو میرزا مغل وغیرہ بھی اُسی وقت گرفتار کئے گئے ہوں گے، کیونکہ وہ سب ایک ہی جگہ تھے۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہڈسن صاحب نے بادشاہ کو تو گرفتار کیا اور ان لوگوں کو چھوڑ دیا جو انگریزوں کے قتل کے اصلی مجرم تھے اور جنھوں نے باغی فوج کی سرداری کی تھی اور جن کی نسبت یہ قوی اندیشہ تھا کہ اگر باغی فوج کے ساتھ چلے جائیں تو مدتوں انگریزی فوج کو پریشان کریں گے۔ اس لئے یقیناً اُن کو بھی بہادر شاہ کے ساتھ ہی گرفتار کیا گیا ہوگا۔

یہ ہو سکتا ہے کہ بادشاہ کی گرفتاری سے کچھ دیر بعد وہ گرفتار ہوئے ہوں اور اُنھوں نے جاں بخشی کا وعدہ نہ ہونے کے سبب مقابلہ کا ارادہ کیا ہو۔

بہر حال اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ مقتول شہزادوں میں سے بعض اُن انگریزوں اور عورتوں اور بچّوں کے قتل کرانے یا اُس قتل سے رضامند ہونے کے مجرم ضرور تھے جو ایام غدر میں قلعہ کے اندر مارے گئے تھے

چار مہینے اور چار دن کی بادشاہی

وہ جو کہتے ہیں چار دن کی چاندنی اور پھر اندھیری رات، یہ مثل بہادر شاہ پر بالکل صادق آئی۔ ۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو دہلی انگریزوں کے قبضہ سے نکلی اور بہادر شاہ کے قبضہ میں آئی اور چار مہینے اور چار دن کے بعد ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پھر بہادر شاہ سے چھن کر انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئی۔

یہ چار دن چار مہینے کی بادشاہت فقط نام کی بادشاہت تھی ورنہ فوجی سپاہی اس قدر بے ادب اور گستاخ تھے کہ پکار پکار کر کہتے تھے کہ جس کے سر پر ہم جوتی رکھ دیں وہی بادشاہ ہے، یوں دیکھنے اور کہنے کو بادشاہ کے نام کا ڈھنڈورہ پیٹا جاتا تھا، مگر بادشاہ کا حکم پوری اطاعت سے کوئی نہ مانتا تھا اور تمام شہر میں ایک عام افراتفری اور بے امنی چھائی ہوئی تھی۔

بخت خاں اور میرزا مغل کا اقتدار بے شک تسلیم کیا جاتا تھا، اور میرزا خضر سلطان وغیرہ شہزادوں کے اختیارات بھی قایم نظر آتے تھے لیکن ضبط نظم اور ضابطہ کی اصلی پابندیاں نام کو بھی نہ تھیں، بہرحال جیسا کچھ بھی تھا پھر بھی بادشاہی کا نام ہوگیا تھا۔ جو چار مہینے چار دن کے بعد بالکل نابود ہو گیا۔ اور اب تو جب کہ ۱۹۲۲ء کا دور دورہ ہے، بادشاہ کی اولاد دہلی میں بھیک مانگتی پھرتی ہے ؂

بیمار اور زخمی قتل کر دیے جاتے تھے

منشی ذکاءاللہ صاحب اپنی تاریخ کے صفحہ ۶۴۶ پر لکھتے ہیں کہ جب جامع مسجد پر قبضہ ہوگیا تو خبر آئی کہ باغیوں کا کیمپ بالکل خالی پڑا ہے۔ لفٹننٹ

ہڈسن سوار بے کر دوڑے ہوئے گئے اور کیمپ پر قبضہ کر لیا۔ باغی ایسی گھبراہٹ میں لگ گئے تھے کہ ان کی گیلی دھوتیاں الگنیوں پر پھیلی ہوئی تھیں اور اُن کو اُتارنے کی فرصت بھی نہ ملی تھی۔

کیمپ میں جس قدر زخمی اور بیمار پائے گئے اُن کو قتل کر دیا گیا اور یہاں سے کپڑے اور گولی بارود بکثرت دستیاب ہوا۔"

پھر اُسی صفحہ پر لکھتے ہیں :- "بریڈ صاحب کی درخواست پر جنرل ولسن نے میگزین کی طرف سے قلعہ پر حملہ کرنے کے لئے ایک کالم بھیجا۔ ہوم صاحب نے بارود سے قلعہ کا دروازہ اُڑایا اور فوج نعرے لگاتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ قلعہ کے حصّہ میں باغیوں کا ہسپتال تھا اور وہاں وہ زخمی پڑے ہوئے تھے جو اپنی پلٹنوں کے ساتھ جا نہیں سکتے تھے، انگریزی سپاہ نے اپنی گولیوں سے اُن کے زخموں کا علاج کر دیا۔"

اور بھی کئی واقعات بیماروں اور زخمیوں کے قتل و ہلاکت کے احوالِ غدر میں مذکور پائے جاتے ہیں، جن کو پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ باغیوں کی حرکات کیسی ہی ناشائستہ اور ظالمانہ ہوں، پھر بھی انگریزوں کی متمدن اور مہذب قوم کو اس قسم کی وحشیانہ سفاکی سے احتیاط کرنی چاہیے تھی۔

بیماروں اور زخمیوں کا قتل کرنا ایسا ہی خوفناک جرم ہے جیسا عورتوں اور بچّوں کا ہلاک کرنا۔ کوئی شخص بھی باغیوں کو ملامت کرنے سے خاموش نہیں ہو، کیونکہ انھوں نے بیگناہ عورتوں اور بچّوں کو مارا تھا، مگر انگریزی فوج بھی زخمیوں اور بیماروں کو ہلاک کرنے کی ملامت سے محفوظ نہیں رہ سکتی ہے۔ جنرل ولسن کا یہ عذر تسلیم کرنے کے قابل نہیں ہے کہ "فوج قابو سے باہر تھی اور اُس کے انگریز افسروں کو اپنی عورتوں اور بچّوں کی مظلومیت یاد آتی تھی"۔ کیونکہ وہ جنرل بہت ناقابل ہوتا ہی جو اپنے ماتحتوں پر

اقتدار نہ رکھتا ہو اور جس کو اتنا اختیار بھی نہ ہو کہ وہ خلاف تہذیب و خلاف انسانیت مظالم شدید سے ماتحتوں کو روک سکے، یقیناً جنرل ولسن اور سب انگریز جوشِ انتقام میں بھول گئے تھے کہ بیماروں اور زخمیوں کا قتل کرنا بہت بڑی وحشیانہ و ظالمانہ خطا ہے ورنہ وہ ایسا نہ کرتے۔

دہلی والوں کے نزدیک

انگریزوں کے گولے شبرات کی آتشبازی تھی

دہلی شہر کے باشندوں کی یہ خصلت تمام ملک میں نرالی ہے کہ وہ غم اور مصیبت کے وقت بھی تفریح اور خوش باشی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ انگریزوں نے جب شہر پر گولہ باری شروع کی تو بجائے اس کے کہ باشندے خائف ہوتے یا گھبرا کر بھاگتے شب برات کی آتشبازی کی طرح توپوں کے گولے ان کے لئے مذاق و تفریح کا ایک تماشہ ہو گئے، مکانوں کی چھتوں پر لوگ چڑھ جاتے اور لوگوں کی سیر دیکھتے اور جب گولے شہر کی طرف آتے تو بے تحاشا غل مچاتے، وہ آیا۔ وہ آیا۔ دیکھو وہ اُدھر چلا۔ آہاہا وہ گرا۔ وہ پھٹا۔ جس جگہ گولہ گرتا، وہاں سینکڑوں آدمیوں کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔ گولے کچھ اس قسم کے تھے کہ اُن سے کچھ زیادہ نقصان نہ ہوتا تھا شہر کی سڑکیں چوڑی تھیں، مکانوں کے صحن بھی فراخ تھے، باغات کی کثرت تھی۔ اس واسطے گولوں سے زیادہ نقصان نہ پہنچتا تھا، ہزاروں گولے آئے مگر نقصان دس بیس گھروں اور سو پچاس عورتوں، بچوں اور اجل رسیدہ مردوں کے سوا کسی کا نہ ہوا۔ تعجب یہ ہے کہ چار آدمی مرتے تھے تو چار سو تماشہ دیکھنے کو وہاں اکھٹے ہو جاتے تھے۔ میں نے اپنے والد سے سُنا کہ جب پہاڑی پر سے گولہ باری ہوتی تھی، ہم ہمایوں

کے مقبرہ کی چھت پر چڑھ کر تماشا دیکھا کرتے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ رات کے وقت گولہ توپ کے منہ سے نکلتا تو

ایک گول انگارہ

معلوم ہوتا تھا، وہ گول انگارہ شائیں شائیں کرتا ہوا دور نکل جاتا، اس کے بعد توپ کی آواز آتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ گولہ پہلے نکل جاتا ہے، اور آواز بعد میں ہوتی ہے۔

مقبرہ ہمایوں پہاڑی سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے، رات کے اندھیرے میں گولہ چمک کے سبب پہلے دکھائی دیتا ہوگا اور آواز بعد میں آتی ہوگی، کیونکہ روشنی کی رفتار آواز کی رفتار سے تیز ہوتی ہے۔

دہلی والوں کی بے فکری اور خوش باشی اسی ایک واقعہ پر ختم نہ تھی، بلکہ جب روزانہ پھانسیاں ہو رہی تھیں اور اندھا دھند قتل عام شہر میں جاری تھا۔ تب بھی دہلی والوں کی خوش باشی کی عادت میں کمی نہیں ہوتی تھی۔ بڑے بڑے اُمراء کا یہ حال تھا کہ شام کو گرفتار ہوئے، حوالات میں بند کئے گئے۔ صبح پھانسی پانے کا یقین ہے، مگر رات کاٹنے کے لئے شطرنج، گنجفہ، چوسر ہو رہی ہے۔

اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ دہلی کی یہ خصلت کیسی عجیب ہے، یا تو یہ وجہ تھی کہ صدمے اُٹھاتے اُٹھاتے اُن کے دل سخت ہو گئے تھے اور یا خدا نے دہلی والوں کو دل ہی ایسا دیا ہے، جو کسی وقت بھی تفریح اور خوشباشی سے خالی نہیں رہتا۔

جانکنی کا ماجرا

کلیجہ شق ہو جانے کا بیان ہے۔ ۱۴ ستمبر کی تاریخ نے انگریزوں کو شہر کے اندر جگہ دی اور شہر والوں کو باہر نکل جانے کا حکم دیا۔ انگریز پہلے کشمیری و کابلی و موری دروازہ کے رُخ سے داخل ہوئے تھے، اس لئے وہاں کی آبادی سمٹ کر

فراش خانہ، ترکمان دروازہ اور اجمیری دروازہ کی طرف آگئی، مگر جب یہ علاقے بھی مفتوح ہو گئے تو باشندے دروازوں سے نکلکر جنگلوں اور دیہات میں بھاگنے لگے۔ وہاں گوجروں اور میواتیوں نے ان کو لوٹنا شروع کیا۔

باوجود اس عام بھاگڑ کے پھر بھی شہر میں ہزاروں گھر آباد تھے، ہندوں کا مشہور محلہ نیل کا کٹرہ تو بالکل آباد تھا۔ اس کا ایک آدمی بھی باہر نہیں گیا، کیونکہ لالہ چھیسری پرشاد کمسریٹ کے گماشتے اس محلہ میں رہتے تھے، اور اُنھوں نے اپنی خیر خواہی اور خدمات سرکاری کے عوض اپنے محلہ کی حفاظت کا عہد افسروں سے لے لیا تھا۔

بلی ماروں کے محلہ میں حکیم محمود خاں صاحب کا مکان محفوظ تھا۔ کیونکہ پٹیالہ کے مہاراجہ نے اپنے تعلقات کے سبب انکی حفاظت کا اقرار انگریزوں سے کرالیا تھا اور پٹیالہ کے فوجی سپاہی حکیم صاحب کے مکان پر بطور پہرہ دار ہر وقت موجود رہتے تھے۔

پٹیالہ کے وزیر دیوان نہال چند کا مکان بھی پٹیالہ کے تعلقات کے سبب محفوظ تھا۔ بعض اور ہندو مسلمانوں کے مکان بھی سرکاری خیر خواہی کے صلہ میں محفوظ تھے۔ مثلاً شیخ تراب علی کا مکان میر عاشق کے کوچہ میں اور رائے سداسکھ لال کا مکان ترکمان دروازہ میں۔ ان لوگوں کو شہر میں رہنے کے سارٹیفکٹ مل گئے تھے، مگر یہ سارٹیفکٹ ان کو شہر میں رہنے کی اجازت دیتے تھے، لوٹ مار کا خوف ان سے دور نہ ہوتا تھا، کیونکہ جاہل سپاہی جو لوٹ کے شوقین تھے سرکاری اسناد کی بہت کم پروا کرتے تھے۔

میرزا غالب اور میر بدرالدین مُہرکن بھی گرفتار ہو کر کرنل برن حاکم شہر کے سامنے پیش ہوئے تھے مگر جب اُنھوں نے سرکاری اسناد دکھائیں اور غدر سے اپنی بے تعلقی ظاہر کی تو ان کو شہر میں آباد رہنے کی اجازت مل گئی۔ اسی طرح راجچند

صاحب پروفیسر دہلی کالج کو بھی امان دیدی گئی ۔

دردناک نظارہ

کرنل برن شہر کے فوجی گورنر بنائے گئے تھے انھوں نے چاندنی چوک میں قطب الدین سوداگر کی کوٹھی میں اقامت اختیار کی تھی، اور ایک دستہ فوج کا اس کام کے لئے مقرر کیا تھا کہ وہ جہاں آبادی پائے باشندوں کو گھروں کے اسباب سمیت گرفتار کر کے لے آئے، اس دستہ فوج نے اس حکم سے بہت ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ سپاہی بہت بیرحمی سے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر لاتے تھے، مردوں کے سر پر گھر کا اسباب لادا جاتا تھا، عورتوں کو جبراً ساتھ لیا جاتا تھا، آگے آگے مرد اسباب کے گٹھر سر پر رکھے ہوئے، پیچھے پیچھے اُن کی عورتیں زار و قطار روتی ہوئیں، چھوٹے چھوٹے سہمے ہوئے بچوں کو گود میں لئے ہوئے۔ کسی عورت کی گود میں بھی بچہ ہوتا تھا، اور پیدل بھی کئی کئی بچے انگلی یا چادر کا آنچل پکڑے ساتھ ہوتے تھے، وہ شریف زادیاں پیدل چلنے کی عادی نہ تھیں، خصوصاً اس حال میں کہ بچوں کا ساتھ، بے پردگی کی حالت، بیچاریاں ٹھوکریں کھا کھا کر گرتی تھیں، بچے گود سے گر گر جاتے تھے اور سپاہی ناقابلِ بیان سختی سے اُن کو آگے چلنے کے لئے دھکے دیتے تھے، اور ان کو ان مصیبت زدہ لوگوں پر ذرا رحم نہ آتا تھا۔

جب یہ لوگ کرنل برن کے سامنے پیش ہوتے تو حکم دیا جاتا کہ اسباب میں جس قدر قیمتی چیزیں ہیں اُن کو تلاش کر کے ضبط کر لو۔ بیکار چیزیں واپس دیدو۔ جب اس حکم کی تعمیل ہو چکتی تو دوسرا حکم یہ دیا جاتا کہ ان کو فوجی حراست میں لاہوری دروازہ تک لیجاؤ اور شہر سے باہر نکال دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوتا اور وہ لوگ لاہوری دروازہ کے باہر دھکے دیکر نکال دیے جاتے۔ یہ تمام حالات منشی

ذکاءاللہ کی تاریخ میں ہیں)

خیال کرنے کی جگہ ہے کہ وہ غریب بال بچوں کو لیکر ایسی حالت میں کہ اُن کے پاس ایک پیسہ بھی کھانے کے لیے نہو کہاں جاتے ہوں گے اور اُن کے بچوں پر کیا گزرتی ہوگی؟ اس تکلیف کا اندازہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص خود یہ تصور کرے کہ مجھپر اور میرے اہل وعیال پر یہ حالات گزر رہے ہیں۔

غرض دہلی شہر کے باہر ہزاروں مرد اور عورتیں اور بچے بیکسی کے عالم میں ننگے پاؤں، ننگے سر، بھوکے پیاسے پھر رہے تھے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہ تھا۔ نہ بیٹھنے کو جگہ تھی، نہ دھوپ سے بچنے کو سایہ تھا، نہ پینے کو پانی کا گھونٹ میسر تھا۔ بعض نیک دل لوگوں نے چنے اُبال کر ان لوگوں کو تقسیم کرنے شروع کئے۔ پھر بھی اتنے زیادہ آدمیوں کا پیٹ بھرنا مشکل تھا، سینکڑوں بچے بھوک بھوک کہتے ہوئے ماؤں کی گودوں میں مر گئے۔ سینکڑوں مائیں چھوٹے بچوں کو اکیلا چھوڑ کر اس مصیبت سے نجات پانے کے لیے کنوؤں میں ڈوب مریں۔

ہزاروں عورتیں ڈوبکر مر گئیں

ہزاروں عورتیں ایسی تھیں کہ وہ گھر سے باہر نہ نکلیں، اور پردہ کے سبب اُنھوں نے گھر میں مر جانا قبول کیا اور جس وقت اُنھوں نے سُنا کہ فوج آتی ہے تو کنوؤں میں گرنے لگیں۔ اور اس کثرت سے گریں کہ ڈوبنے کو پانی نہ رہا۔ یعنی کنوئیں اُن کی لاشوں سے بھر گئے، اور جب دوسری عورتیں اُن پر گریں تو چونکہ ڈوبنے کو پانی نہ تھا وہ لاشوں پر پڑی رہیں۔

ایک فوجی افسر کا بیان ہے کہ "ہم نے اس قسم کی سینکڑوں عورتوں کو کنوؤں سے زندہ نکالا جو کنوئیں میں لاشوں کے سبب جگہ نہونے سے ڈوبی نہ تھیں اور زندہ پڑی تھیں

یا بیٹھی تھیں۔

جس وقت ہم نے اُن کو نکالنا چاہا تو وہ چیخنے لگیں کہ برائے خدا ہم کو ہاتھ نہ لگاؤ اور گولی سے مار ڈالو۔ ہم شریف بہو بیٹیاں ہیں، ہماری آبرو خراب نہ کرو۔ اور جب ہم اُن کو باہر نکالتے تھے تو وہ ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگتی تھیں، اور بعض اُن میں بیہوش ہو کر گر پڑتی تھیں۔"

ایک کنوئیں سے کسی عورت کی لاش نکلی جس نے اپنے دو بچوں کو چھاتی سے باندھ لیا تھا، ایک بچہ چھ مہینے کا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا دو سال کے قریب تھا، مرنے کے وقت وہ ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے دبا کر کلیجہ سے لگائے رہی ہوگی، کیونکہ اُس کے دونوں ہاتھ بچوں کے اوپر چمٹے ہوئے تھے۔

فراشخانہ کے کسی کنوئیں میں دو عورتیں زندہ نکالی گئیں، ایک جوان تھی، مگر اندھی تھی، دوسری بڑھیا تھی، بڑھیا کے بیان سے معلوم ہوا کہ اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ جس کو گھر میں گھس کر قتل کر دیا گیا، اور جب وہ قتل کیا جا رہا تھا۔ چند سپاہیوں نے اُس کی اندھی بہن کی عصمت پر حملہ کرنا چاہا، مگر وہ اپنے گھر کے کنوئیں سے واقف تھی دوڑ کر اُس میں گر پڑی اور اُس کے ساتھ ہی میں بھی کنوئیں میں کود ی۔ ہم دونوں پانی میں غوطے کھا رہے تھے کہ کسی نے اندر آ کر ہم کو باہر نکالا۔

ایک مسلمان گرفتار ہو کر آیا اور اُس نے بیان کیا کہ جب میں نے حالت نازک دیکھی تو اپنے ہاتھ سے اپنی بیوی اور بہو اور جوان بیٹی کو قتل کر دیا۔ کیونکہ مجھے اُن کے بے آبرو ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس کے بعد بندوق لے کر لڑنے نکلا اور گرفتار ہوا۔ حاکم نے اُس کا بیان سُنکر حکم دیا کہ اس کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے۔ چنانچہ اُس کو پھانسی دیدی گئی۔

مُسلمان چُن چُن کر مارے جاتے تھے

غدر کی ابتدا خواہ کسی فرقہ کی طرف سے ہوئی ہو، مگر مسلمان بادشاہ کی سرپرستی اور مسلمان قوم کی عملی سرگرمی کے سبب زیادہ قصور وار مسلمان ہی سمجھے جاتے تھے اور دہلی لینے کے بعد سب سے زیادہ مسلمان ہی چُن چُن کر قتل کئے جارہے تھے وہ دوہری مار کا شکار تھے، ایک طرف تو انگریز ان سے ناراض تھے اور دوسری طرف سکھ سپاہی اپنا پُرانا غصہ ان پر اُتارنا چاہتے تھے، کیونکہ ان کے گرو تیغ بہادر صاحب کو کسی مُسلمان بادشاہ نے دہلی میں قتل کیا تھا اور سکھوں کو اس تاریخی قتل کا انتقام مسلمانوں سے لینا تھا۔ اس واسطے سکھ سپاہی جہاں کہیں کسی جوان اور خوبصورت مسلمان کو دیکھتے مار ڈالتے تھے۔ منشی ذکاءاللہ صاحب نے لکھا ہے کہ سکھوں کے ہاتھ سے تمام شہر کے خوبصورت اور جوان مسلمانوں کا خاتمہ ہوگیا، وہ بوڑھے باپ کے سامنے اُس کے جوان بیٹوں کو قتل کر ڈالتے تھے اور باپ کو رنج اُٹھانے کے لئے زندہ چھوڑ دیتے تھے۔

جب پہلے پہل انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی اُس وقت تو جو سامنے آتا تھا، گولی سے مار ڈالا جاتا تھا، ہندو مُسلمان کی تخصیص نہ تھی، مگر بعد میں صرف مسلمان ہی چُن چُن کر مارے جاتے تھے (تاریخ ہند صفحہ ۷۰۵)

کوچۂ چیلان کی مُصیبت

دہلی کے تمام محلوں سے زیادہ چیلوں کے کوچہ پر مصیبت آئی تھی، اس محلہ میں بڑے بڑے شرفا اور نامور علما رہتے تھے۔ مولانا شاہ ولی اللہ و شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کا گھرانا اسی محلہ میں آباد تھا۔ سر سید احمد خاں کا گھر بھی اسی محلہ کے

ایک حصہ میں تھا، مولانا صہبائی بھی اسی محلہ میں رہتے تھے۔ غرض یہ محلہ بڑے بڑے صاحب کمال لوگوں کا مخزن تھا، منشی ذکاء اللہ صاحب بھی اسی محلہ کے باشندے تھے، اور اب بھی ان کے لڑکے اسی محلہ میں آباد ہیں، مگر غدر کے وقت منشی صاحب شہر کے باہر چلے گئے تھے اور سرسید بھی اپنے کنبہ بمعیت دہلی میں نہ تھے۔

منشی ذکاء اللہ صاحب لکھتے ہیں :۔ "اس مصیبت خاص کا سبب یہ ہوا کہ نواب شمشیر جنگ خاں کے بیٹے محمد علی خاں اور یا حکیم فتح اللہ خاں نے کسی انگریزی سپاہی کو زخمی کر دیا تھا، کیونکہ وہ اُن کے زنانہ مکان میں بُرے ارادہ سے جانا چاہتا تھا۔ اس کی خبر انگریزی کمان افسر کو ہوئی تو اُس نے حکم دیا کہ اس کوچہ کے تمام مَردوں کو قتل کر دو یا گرفتار کر کے لے آؤ۔

اس حکم کی تعمیل ایسی بیدردی سے ہوئی کہ محلہ میں کوئی مرد زندہ نہ بچا۔ یا تو سپاہیوں نے گھروں میں گھسکر مار ڈالا یا گرفتار کر کے حاکم کے سامنے لیگئے۔ حاکم نے اُنکو دیکھکر حکم دیا کہ سب کو دریا کے کنارے لیجاؤ اور گولی مار دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

ان لوگوں کو رسّی سے باندھا گیا، دریا کی ریتی میں قطار بنا کر کھڑا کیا گیا۔ اور گولیوں کی باڑھ ان پر چلائی گئی جس سے سب مر کر گر پڑے۔ صرف دو آدمی زندہ بچے، جن کے گولی نہ لگی تھی، جب سپاہی گولیاں مار کر چلے گئے تو یہ دونوں اُٹھکر بھاگے، ان میں ایک مرزا مصطفٰے بیگ تھے جو بعد میں رسالہ میں نوکر ہو گئے تھے، اور دوسرے مولانا صہبائی کے داماد اور بھانجے وزیرالدین نامی تھے جو بعد میں کانپور کچی کے سررشتہ دار ہو گئے تھے"۔

مقتولوں میں ہندوستان کے آفتاب و ماہتاب

ان مقتولوں میں ہندوستان کے دو چاند سورج بھی تھے، ایک مولانا صہبائی جنکی

فارسی دانی تمام ہندوستان میں مسلم تھی، اور ان سے زیادہ فارسی علم کا جاننے والا تمام ملک میں کوئی نہ تھا، میرزا غالب کے رقعات میں مولانا صہبائی کا بڑے دردانگیز الفاظ سے ذکر ہے۔ اور غالب ان کے کمالات کے بڑے قدردان تھے۔ مفتی اعظم مفتی صدرالدین آزردہ نے مولانا صہبائی کے قتل کی خبر سُنی تو شعر کہا۔

قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو
کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو

مقتولوں میں دوسرے نامور شخص سید محمد امیر عرف میر پنجہ کش تھے۔ جن کی خوشنویسی کا لوہا تمام ہندوستان مانتا تھا، اور ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے حروف سونے چاندی کے عوض خریدے جاتے تھے۔ وہ بھکاری فقیروں کو ایک حرف لکھکر دیدیتے تھے، جو ایک روپیہ کے نوٹ کی طرح ہر جگہ، روپیہ کو بک جاتا تھا، افسوس کہ یہ صاحب کمال بھی دریا کی ریتی میں مارا گیا۔

چیلوں کے کوچہ والے جو دریا کی ریتی میں بیٹھا ہلاک کیے گئے اُن کی تعداد کا صحیح علم کسی کو نہیں، مگر اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ صرف مولانا صہبائیؒ کے کنبہ کے اکیس آدمی اس قطار میں مارے گئے، تو ظاہر ہے کہ جب ایک شخص کے ہمراہ ہی اکیس تھے تو باقی اور بڑے آدمیوں کے ساتھی کتنے کتنے ہوں گے۔

صرف مسلمانوں کو باغی سمجھا جاتا تھا

ایک ڈاکٹر صاحب کا ذکر تاریخ ہند میں ہے جن کا نام منشی ذکاءاللہ صاحب نے نہیں لکھا ہے، وہ صرف مسلمانوں کو باغی سمجھتے تھے، جب کسی سے ملتے تو پوچھتے کہ تو مسلمان ہے یا ہندو؟ اگر وہ ہندو کہتا تو جانے دیتے، اور مسلمان کہتا تو مار ڈالتے ایک دوست نے اُن کو اس غلطی سے آگاہ کیا کہ بغاوت میں دونوں قومیں شریک تھیں، تب اُنھوں نے مسلم کشی سے ہاتھ اُٹھالیا۔

گولی سے کتنے آدمی مارے گئے

انگریزی تاریخوں میں صرف گولی سے مارے جانے والوں کی تعداد سولہ سو لکھی ہے مگر مرنے والوں کا شمار ایسی افراتفری اور عام پریشانی کے وقت کون کیا کرتا ہے۔ مردم شماری میں زندہ آدمیوں کے شمار کے لئے تو ایک خاص محکمہ بنایا جاتا ہے۔ مُردہ آدمیوں کا گننا اور پھر اُن کو قلم بند کرنا بالکل خلاف قیاس بات ہے۔ معلوم نہیں کتنے مر گئے اور کس قدر مارے گئے۔ ان کی گنتی معلوم بھی ہو تو کیا فائدہ ہوگا؟

لارڈ رابرٹس فیلڈ مارشل کی کتاب تاریخ چہل و یک سالہ میں ایک نظارہ دہلی کے مرنے والوں کا درج ہے، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ کس کثرت سے لوگ مارے گئے تھے، لارڈ موصوف نے صرف ایک دن کا نظارہ دکھایا ہے، اور خونریزی تو خبر نہیں کتنے دن قائم رہی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:-

"ہم صبح کو لاہوری دروازہ سے چاندنی چوک میں گئے، تو ہم کو شہر حقیقت میں مُردوں کا شہر نظر آتا تھا۔ کوئی آواز سوائے ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں کے سُنائی نہیں دیتی تھی، کوئی زندہ آدمی نظر نہیں آیا سب طرف مُردوں کا بچھونا بچھا ہوا تھا، جس میں بعض حالتِ نزع و جاں کنی میں مبتلا تھے۔

ہم چل رہے تھے تو بہت آہستہ آہستہ بات کرتے تھے، خوف تھا کہ ہماری آواز سے مُردے نہ چونک پڑیں، اس بات کے دیکھنے سے کہ ایک طرف مُردوں کی لاشوں کو کُتے کھا رہے ہیں اور دوسری طرف لاشوں کے آس پاس گِدھ جمع ہیں جو اُنکے گوشت کو نوچ نوچ کر مزے سے کھا رہے ہیں اور ہماری آمد کی آواز سے اُڑ اُڑ کر تھوڑے فاصلہ پر

جا بیٹھتے ہیں ہم کو بڑی عبرت ہوتی تھی اور ہمارا دل رنجور ہو جاتا تھا بہت سے مُردے ایسے پڑے تھے گویا وہ زندہ ہیں بعض مُردوں کے ہاتھ اُوپر کو اُٹھے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

غرض ان مُردوں کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی جیسے کہ ہم کو ان کے دیکھنے سے ڈر لگتا تھا ویسے ہی ہمارے گھوڑے ان کو دیکھ کر ڈر کے مارے بدکتے اور ہنہناتے تھے، مُردوں کی لاشیں پڑی سڑتی تھیں۔ اُن کے تعفن سے ہوا میں بیمار کرنے والی بدبُو اُٹھ رہی تھی"۔

اسی طرح ایک اور رحمدل انگریز نے دہلی کی حالت پر نہایت سادہ مگر مؤثر الفاظ میں لکھا ہے:۔

"دلّی کے باشندے اگرچہ سب نہیں مگر آدھے بے قصور شہر کے گرد و نواح۔ دیہات و جنگلوں میں پڑے ہوئے ہلاک ہو رہے ہیں"۔

لارڈ رابرٹس جنگی آدمی تھے، مگر اُنھوں نے شاعروں کی طرح ایسا صحیح اور دردناک منظر دہلی کے بازار کا لکھ کر پیش کیا ہے جسکو پڑھ کر کلیجہ شق ہوا جاتا ہے، اور معلوم ہوتا ہے کہ دہلی میں اِس شدت سے لوگ مارے گئے تھے کہ بازار لاشوں سے بھرے پڑے تھے پھر جو انگریزی تاریخوں میں صرف ننوّے سو آدمیوں کا گولی سے مارا جانا لکھا گیا ہے۔ اُسپر کیونکر یقین کیا جا سکتا ہے۔

بہرحال دہلی میں جس قدر لوگ مارے گئے، اُن میں کم از کم آدھا حصّہ اور عورتوں کا پورا حصّہ محض بے گناہ تھا، اور ناعاقبت اندیش باغیوں کی حرکات ناشائستہ کے وبال میں یہ مظلوم خواہ مخواہ موت کے گھاٹ اُتارے گئے۔

بیمار کی پھانسی

مرنے کے بعد بھی بیماری کا اثر موجود تھا

انگریزوں کی خطا نہیں، بعض ہندوستانی جھوٹ بول بول کر انگریزوں سے ظلم کراتے تھے، بہادر شاہ کے بھائی میرزا بابر کا لڑکا میرزا کالے مخبروں میں نوکر ہوگیا تھا، اُس نے اپنے خاندان والوں پر ایسے ایسے ظلم کرائے۔ جن کے سُننے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، وہ اپنی کارگزاری دکھانے کو ایسے ایسے جھوٹ بولتا تھا جن کا کچھ بھی سر پیر نہ ہوتا تھا، معمولی شہزادوں کو گرفتار کراتا اور اُن سے کہدیتا کہ صاحب کے سامنے جاکر کہدینا کہ ہم بادشاہ کے قریبی رشتہ دار ہیں، اگر تم یہ کہوگے تو تم کو بادشاہ کے ساتھ رکھا جائے گا۔ اور تمھاری پنشن مقرر ہوجائے گی۔

دوسری طرف حکام سے جاکر کہتا کہ میں نے فلاں شہزادہ کو گرفتار کرایا ہے جو بادشاہ کا ایسا قریبی رشتہ دار ہے، اور جس نے غدر میں انگریزوں کے خلاف بڑے بڑے کام کئے ہیں، اور ایسے شخص کا گرفتار کرانا معمولی بات نہ تھی،

حکام اس کی باتوں سے دھوکے میں آجاتے تھے، اور بچارے شہزادوں کو بے گناہ پھانسیاں ہوجاتی تھیں۔

انہی بے خطا شہزادوں میں ایک شہزادہ میرزا قیصر نامی تھے جو بہادر شاہ کے دادا شاہ عالم کے بیٹے تھے، وہ اس قدر بوڑھے تھے کہ اُن کے ہوش حواس بھی درست نہ تھے، اور کوئی شخص یہ خیال بھی نہیں کر سکتا تھا کہ انھوں نے غدر میں کوئی حصّہ لیا ہوگا۔ مگر موذی عقرب صفت مخبر نے انگریز حکام کو میرزا

قیصر کی طرف سے ایسی ایسی بے سروپا باتیں سُنائیں کہ حکام آگ بگولہ ہوگئے اور غریب بوڑھے شہزادہ کو پھانسی دیدی گئی۔

اسی طرح ایک اور بیمار شہزادہ میرزا محمود شاہ نامی تھا۔ یہ اکبر شاہ کا پوتا تھا اور عرصۂ دراز سے گٹھیا کے مرض میں مبتلا تھا۔ غدر کے زمانہ میں بچارا گھر میں بے حس و حرکت پڑا رہتا تھا، گٹھیا کے سبب اس کے ہاتھ پاؤں ایسے اکڑ گئے تھے کہ وہ گولا لاٹھی اور گول مٹول ہوگیا تھا، اس آفت نصیب کی شکایت بھی نون مرچ لگاکر مخبر نے حکام سے جاکر کی اور اس کے بیان سے متاثر ہوکر میرزا محمود شاہ کو بھی پھانسی دیدی گئی، منشی ذکاءاللہ لکھتے ہیں پھانسی پانے کے بعد بھی میرزا محمود شاہ کی لاش گولا لاٹھی بنی لٹکتی رہی اور جو شخص اس لاش کو دیکھتا تھا اور اس کی بیماری کا خیال کرتا تھا تو رنج و افسوس سے بے اختیار رونے لگتا تھا۔

سب انگریز بے رحم نہ تھے

جس شہر میں یہ بے رحمیاں ہو رہی تھیں اُسی شہر میں ایسے رحمدل انگریز بھی تھے جو بے گناہوں کی حمایت کرتے تھے، اور لاوارثوں کے وارث بن کر ان کی طرف سے حکام کے پاس سفارشیں لیجاتے تھے، بیماروں اور زخمیوں کو ہسپتال بھجواتے اپنے پاس سے بھوکوں، محتاجوں کو کھانا دیتے اور کوشش کرتے تھے کہ حکام دہلی سے بے گناہ لوگوں کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہونے پائے۔ مگر ان کی کوشش دو وجہ سے اکثر ناکام رہتی تھی، ایک تو یہ کہ اختیارات عموماً اُن انگریزوں کے ہاتھ میں تھے جن کے بال بچے باغیوں کے ہاتھ سے بےگناہ مارے گئے تھے، اور اُن کے گھروں کو لوٹا گیا تھا اور اُن کو رہ رہ کر اپنے گھروں کی تباہی اور اپنے بچوں اور عورتوں کا بےکسی و ظلم سے مارا جانا یاد آتا تھا اور اس یاد کے سبب غم و غصّہ لمبی

عقل پر پردے ڈالتا تھا، اور وہ حق و ناحق میں اچھی طرح تمیز نہ کر سکتے تھے اور دوسری وجہ یہ بھی کہ خود مخبروں نے سفاکی پر کمر باندھ لی تھی، یہ جاسوس اور مخبر دہلی کے رہنے والے تھے، اور اپنی ناموری اور افسروں کی خوشنودی حاصل کرنے کو طرح طرح کے فرضی قصے تصنیف کرتے تھے، ان میں سے بعض تو خود بغاوت میں شریک رہ چکے تھے، مگر اب دوسروں کو باغی ثابت کرنے کا بیڑا اُٹھایا تھا، اور اس طرح اپنی جان بھی بچانا چاہتے تھے، اور روپیہ کمانا بھی مقصود تھا۔

گامی خاں مخبر کی بہت دھوم تھی، وہ غدر میں باغیوں کے ساتھ تھا، پھر انگریزوں سے آملا اور سیکڑوں بے گناہوں کو پھانسی پر لٹکوا دیا۔ سینکڑوں گھر اُجاڑ دیئے۔ اور بے شمار جھوٹی اطلاعیں حُکام کو دیں۔ گامی کی ہیبت مٹکاف صاحب سے بھی زیادہ تھی۔ لوگ گامی کا نام سُنکر کانپ جاتے تھے، آخر کاغذ کی ناؤ کے ڈوبنے کا وقت آیا اور میاں گامی کے کرتوت کھُل گئے تو حکام نے اس دغا باز کو بھی پھانسی دیدی۔

میرزا کالے کے علاوہ ایک اور مخبر غلام فخرالدین نامی تھا۔ اس نے بھی اپنے شہر والوں کو ستانے اور پھانسیاں دلوانے میں کمی نہیں کی۔

غرض سب انگریز بے رحم نہیں تھے، سوائے چند مخصوص لوگوں کے جن میں مٹکاف صاحب اور ہڈسن صاحب بہت نامور ہوئے، اور کوئی انگریز بھی حد سے زیادہ ظلم و ستم کا حامی نہ تھا۔

سر جان لارنس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے، کہ اُنھوں نے اس قیامت کے وقت دہلی اور اُس کے شریف باشندوں کی اپنی زوردار تحریروں میں ہمیشہ حمایت کی، اور کوئی دقیقہ اس میں باقی نہ رکھا۔ گو برسر اقتدار حکام دہلی اُن کے لکھنے پر بہت کم عمل کرتے تھے اور کہہ دیتے تھے کہ ایسے وقت نرمی نہ کرنی چاہیئے۔

بلکہ اپنی قوت کو اچھی طرح ظاہر کرنا ضروری ہے ۔

شہزادوں کا جیلخانے میں مرنا

جن شہزادوں کو قید کی سزا دی جاتی تھی اُن کی مشقت موت سے زیادہ سخت ہوتی تھی، اول تو وہ مشقت کے عادی نہ تھے، دوسرے کام بھی ان کی بساط اور طاقت سے زیادہ لیا جاتا تھا، اُن کو چکی پیسنے کی عادت نہ تھی، جب زیادہ مقدار میں آٹا پسوایا جاتا اور نہ پستا تو ان پر کوڑوں کی مار پڑتی، یہانتک کہ وہ بیچارے چند ہی روز میں مار کھا کر قید ہستی سے رہا ہو جاتے۔

شہزادوں کا آخری زمانہ ایسی عیش پسندی کا تھا کہ وہ عہدی بندے ہو گئے تھے، وہ نوکر اور لونڈی غلام کی مدد کے بغیر پانی بھی نہ پی سکتے تھے۔ یکایک اتنا بڑا انقلاب ان سے کیوں کر برداشت ہوتا کہ چکی چلا کر آٹا پیستے، دو چار ہی ہاتھ چلانے سے ان کے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے، بازو شل ہو کر کام کرنے سے جواب دیدیتے تھے۔ جیل کے برقنداز تو ہر جگہ دوزخ کے فرشتے ہوتے ہیں وہ ان نازک بدنوں پر ذرا رحم نہ کرتے تھے اور اس قدر کوڑے ان کے مارتے تھے کہ یہ غریب مار کھاتے کھاتے بیہوش ہو جاتے تھے۔ اور یہ تھا اُس سرکشی کا نتیجہ جو ان غریبوں کو بغیر کسی عمل کے بھگتنا پڑا۔

وہی مثل ہے کرے ڈاڑھی والا پکڑا جائے مونچھوں والا۔ بغاوت فوج نے کی، گرفت شہزادوں اور باشندگان شہر کی ہوئی۔ اگرچہ شہزادوں اور شہریوں میں بھی بعض لوگ قصور وار تھے، مگر سب خطا کار نہ تھے۔ اور سزا بلا امتیاز سب کو دی جاتی تھی ۔

والیان ریاست کو پھانسیاں

دہلی کی ایجنٹی میں سات ریاستیں تھیں۔ جھجر۔ پاٹودی۔ دوجانہ۔ لہارو۔ بلب گڑھ۔ فرخ نگر۔ بہادر گڑھ دادری۔

جھجر کے نواب عبدالرحمن خاں پر یہ جرم عائد کیا گیا کہ انھوں نے سر تھیوفلس مٹکاف صاحب کو پناہ نہ دی جبکہ وہ اُن کے پاس باغیوں سے بھاگ کر گئے تھے اور بہادر شاہ کو عرضیاں بھیجیں، اس لئے ۲۰ اکتوبر کو فوج جھجر گئی اور نواب صاحب کو گرفتار کر لائی۔ قلعہ کے دیوانِ عام میں چند روز قید رہے، مقدمہ ہوا، اور آخر پھانسی کی سزا دی گئی اور ریاست ضبط ہوئی۔

بلب گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ پر یہ جرم عائد ہوا کہ اُس نے منڈرو صاحب وکیل رزیڈنٹی کی جان نہ بچائی اور وہ اُس کے علاقہ میں باغیوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ نیز اُس نے بادشاہ کو بہت سی عرضیاں لکھیں، اس کو بھی پھانسی کی سزا دی گئی اور ریاست ضبط۔

فرخ نگر کے نواب احمد علی خاں کو پھانسی اور ضبطی ریاست کی سزا ملی۔

لہارو کے رئیس نواب امین الدین خاں اور نواب ضیاء الدین خاں کچھ دن قید رہے، مقدمہ میں کئی کئی گھنٹے کھڑا رہنا پڑا۔ آخر سر جان لارنس کی کوشش سے رہائی پائی اور ریاست بھی بحال رہی۔

پاٹودی اور دوجانہ پر کوئی جرم عائد نہیں ہوا۔ بہادر گڑھ دادری کے رئیس بہادر جنگ خاں پھانسی سے تو بچ گئے، مگر ریاست ضبط ہوئی اور لاہور میں رہنے کا حکم ملا۔ اور ہزار یا پانسو روپئے ماہوار پنشن مقرر ہوئی۔

پھانسی کا منظر

جب جھجر، بلب گڑھ، فرخ نگر کے رئیسوں کو پھانسیاں دی جاتیں، تو شہر کے سب دروازے بند ہو جاتے، تیسرے پہر کا وقت ہوتا۔ فوج باجہ بجاتی ہوئی آتی اور پھانسی گھر کے سامنے آکر ٹھہر جاتی۔ پھر قلعہ سے پھانسی پانے والے مجرم کو ایک کراچی میں لایا جاتا، جس کے گرد کٹھرا نہ ہوتا تھا۔ مجرم کے ہاتھ پیٹھ کی طرف بندھے ہوئے ہوتے تھے، کوتوالی کے چاروں طرف انگریز تماشائی جمع ہوتے تھے، جب پھانسی کا تختہ کھینچا جاتا تو تماشائی ہنستے۔ اس کے بعد لاش اوندھے منہ کراچی میں ڈال دی جاتی۔ اور شہر کے باہر کسی جگہ دفن کرنے کو بھیجدی جاتی تھی۔

پھانسی پانے والوں کی کئی قسمیں تھیں۔ ایک تو وہ لوگ تھے جو بادشاہ سے تعلق خاص رکھتے تھے یا اُن کے نوکر تھے اور اُنھوں نے قلعہ کے مقتول انگریزوں اور عورتوں بچّوں کے قتل میں حصّہ لیا تھا۔ اور دوسرے وہ تھے جنھوں نے جہاد کے نام سے لڑائی میں حصّہ لیا تھا، اور اب مسجدوں میں بیمار یا زخمی پڑے تھے، تیسرے وہ تھے جنھوں نے میگزین میں انگریزوں کو دق کیا تھا۔ چوتھے باغی سپاہی تھے جو چھپے چھپائے کہیں نہ کہیں سے دستیاب ہو جاتے تھے۔ پانچویں اجمیری دروازہ کے مسلمان موچی تھے، جنھوں نے مٹکاف صاحب پر بانسوں سے حملہ کیا تھا، جبکہ وہ باغیوں سے بھاگ کر اجمیری دروازے کی طرف سے شہر کے باہر جانا چاہتے تھے، چھٹے وہ میواتی اور گوجر تھے جنھوں نے چاروں طرف لوٹ مچا رکھی تھی۔

کوتوالی چاندنی چوک کے سامنے ایک حوض تھا جو اب بند ہو گیا ہی، اُسکے

تین طرف پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں۔

بہت نامناسب کام!

پھانسی دینے کے وقت ایک بات بہت نامناسب پائی جاتی تھی، کہ پھانسی پانے والوں کی ایک قطار لاکر کھڑی کی جاتی تھی، اُس میں سے آدھے پھانسی پر لٹکا دیئے جاتے اور آدھے کھڑے ہوئے دیکھتے رہتے کہ اس کے بعد ہمارا نمبر آئیگا مہذب قوموں کے ہاں یہ بات بہت نامناسب اور عیب سمجھی جاتی ہے۔

دہلی کے بعض شرفا الور کی ریاست میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے جب دہلی میں گرفتاریاں اور قتل کاریاں ہوئیں تو صدہا عمائد و شرفا بھاگ بھاگ کر الور پہنچے، اُن کا خیال تھا کہ الور میں ہم کو امن اور پناہ مل جائے گی، مگر غلام فخرالدین خاں جاسوس موت کا فرشتہ بنکر الور پہنچا اور ایک ایک کو چُن کر گرفتار کر لایا، کچھ تو گڑگانوہ کے مجسٹریٹ کے حکم سے راستہ میں درختوں پر لٹکا دیئے گئے۔ اور باقی دہلی لائے گئے اور یہاں اُن کو پھانسیاں دی گئیں۔

بوڑھی مائیں بیٹوں کی موت دیکھنے آئیں

تاریخ ہند میں لکھا ہے کہ جس وقت الور کے قیدی پکڑے ہوئے آئے اور اُن کو پھانسی کا حکم دیا گیا اور اُن کی پھانسی کا وقت آیا تو قیدیوں میں سے چار جوانوں کی بوڑھی مائیں بھی اُن کی موت کا تماشہ دیکھنے آگئیں، یہ جوان زرق برق کپڑے پہنے ہوئے تھے، سر پر ریشمی اور زریں سیلے بندھے ہوئے تھے، پیروں میں ٹاٹ بافی جوتیاں، چُست انگرکھے، چوڑے چوڑے سینے، گورے

گورے چہرے۔

جس وقت حلال خور نے ان کو پھانسی کے تختے پر کھڑا کیا، ان کی بڑھیا ماؤں کا غم کے مارے عجیب حال تھا، وہ چیخیں مارتی تھیں، پچھاڑیں کھاتی تھیں اور کلیجہ پکڑ کے زمین پر لوٹی جاتی تھیں، اور اُن کے بیٹے دم بخود چپ چاپ اپنی ضعیف ماؤں کی بے قراری دیکھ رہے تھے، دیکھتے دیکھتے تختہ کھینچ گیا اور وہ موت کے پھندے میں لٹکنے لگے۔

اس دن حلال خور نہال ہوگیا تھا، کیونکہ زرین سیلوں اور ٹاٹ بافی جوتیوں کا ایک انبارا اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

دہلی میں ایک رئیس نواب محمد محسن خاں نامی تھے۔ انھوں نے ایک میم کو اپنے گھر میں پناہ دینے کی نیکی کے ساتھ ایک برائی یہ کی میم صاحبہ کی آبرو خراب کر ڈالی جس سے اُن کو حمل ہوگیا، اس جُرم میں نواب صاحب کو بھی پھانسی دی گئی مگر میم نے یہ شرافت برتی کہ نواب صاحب کی بیوی کے مال واسباب کو لوٹ سے بچا دیا اور اپنے پاس سے بھی نقدی دے کر گزارہ کا سامان کر دیا۔

سر جان لارنس کی لائف میں لکھا ہے کہ جس جگہ پھانسیاں دی جاتی تھیں، وہاں ایک دیسی دوکاندار کرسیاں بچھاتا تھا اور اُن پر انگریز افسر آکر بیٹھتے تھے۔ اور دوکاندار کو کرسیوں کا کرایہ دیتے تھے۔ وہاں یہ لوگ پھانسی کا تماشا دیکھتے چرٹ پیتے، اور مرنے کی آخری سیر کرتے تھے، اگر کوئی میم ادھر سے گزرتی تو وہ پھانسی کا منظر نہ دیکھ سکتی اور ٹوپی سے اپنی آنکھوں اور چہرہ کے سامنے آڑ کر لیتی تھی۔

مسلمانوں کے لئے ایک جُرم یہ بھی تھا کہ ان کی شان سپاہیانہ ہے یا نہیں؟ اگر کسی مسلمان کی شان سپاہیانہ ہوتی تو پھانسی دینے کا ایک بڑا سبب یہی ہو جاتا

تھا، تاریخ ہند میں ہے کہ ایک روز بارہ مسلمان گرفتار ہو کر آئے اُن کا کوئی جرم ثابت نہ ہوا تو اس خطا پر اُن کو پھانسی دیدی گئی کہ ان کی صورت سپاہیانہ ہے اور وہ ضرور بغاوت میں شریک ہوئے ہونگے۔

غدر سے پہلے تمام مُسلمان حتیٰ کہ علمار اور درویش بھی سپاہیانہ وضع رکھتے تھے، حضرت مولانا فخر الدین فخر صاحب نے تمام عمر سپاہیانہ وضع رکھی۔ مگر غدر کے بعد یہ مجرم ہونے کی علامت تھی۔

اُمرا و شرفا حوالات میں

نواب حامد علی خاں، حکیم احسن اللہ خان، نواب احمد قلی خان، سید سردار مرزا مفتی صدر الدین وغیرہ نامور امرا و شرفار مدتوں حوالات میں رہے، ان میں بعض امیر زادے ایسے بے فکرے تھے کہ شطرنج، گنجفہ، چوسر کے کھیل میں مصروف رہتے، حالانکہ ان میں سے روزانہ ایک دو آدمیوں کو پھانسیاں ہوتی تھیں، مگر ان کے لہو ولعب کا شوق اس کے باوجود باقی تھا۔

مٹکاف صاحب کو ایک دن خبر ملی کہ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان میں بعض بہت سے باغی پوشیدہ ہیں، وہ فوج لے کر گئے اور سب کو ایک رسہ کے حلقہ میں گرفتار کر کے کوتوالی لے آئے۔ حکیم محمود خاں بھی مروت و شرافت کے سبب گرفتار شدہ لوگوں کے ساتھ کوتوالی چلے گئے، شہر میں چرچا ہوا کہ حکیم صاحب بھی گرفتار ہوئے، مگر وہ اپنی خوشی سے گئے تھے، رات بھر کوتوالی میں رہے۔ صبح کو چلے آئے، اور اُن کی کوشش سے وہ سب قیدی بھی چھوٹ گئے جو ان کے مکان سے گرفتار ہوئے تھے۔

شہر کے آس پاس درگاہ قدم شریف اور عرب سرائے، پُرانے قلعہ اور

درگاہ سلطان جی صاحب میں جو لوگ بھاگ کر چلے گئے تھے، ان کی تلاش کے لئے سر تشکاف روزانہ فوج لے کر جاتے تھے اور رسہ کے حلقے میں گھیر لاتے تھے، گھیرا پڑنے کی جگہ جگہ ہیبت چھائی ہوئی تھی، ان قیدیوں کو قید و جرمانہ کی سزائیں ملتی تھیں، مگر مسلمانوں کے پاس جرمانہ دینے کو کچھ باقی نہ تھا اس لئے وہ عموماً قید کئے جاتے تھے:۔

شہزادۂ امیر الملک کا بیان

اس کتاب کی تحریر کے وقت میں شہزادہ میرزا امیر الملک عرف میرزا بُلاقی سے ملا، اور اُن سے تاریخی باتوں کی تصدیق چاہی، کیونکہ وہ غدر میں موجود تھے اور آج کل چاندنی محل کے محلہ میں رہتے ہیں۔

اُنھوں نے کہا کہ میرزا قیصر کی پھانسی کا قصہ سچا نہیں معلوم ہوتا کیونکہ وہ غدر کے بعد تک زندہ رہے، اور اپنی موت سے مرے، مگر یہ واقعہ منشی ذکاء اللہ صاحب نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے، ممکن ہے میرزا بُلاقی صاحب کو پورا علم نہ ہو۔

میرزا بُلاقی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ گامی خاں مخبر کا بڑا خوف لگا رہتا تھا میں اپنی والدہ کے ساتھ درگاہ حضرت سلطان جی کے قریب ایک مقبرہ میں تھا کہ ایک نوکر آیا اور اماں سے کہا کہ گامی خاں کہتے تھے کہ یہ لڑکا (میرزا بلاقی) بہادر شاہ سے خوشخطی سیکھا کرتا تھا، مجھے اس کا حال معلوم ہے۔ بس یہ سنتے ہی والدہ ڈر گئیں اور جب اُنھوں نے یہ سُنا کہ گامی خاں درگاہ میں آیا ہوا ہے تو اُنھوں نے مجھ کو تو چارپائی کی ادوان پر لٹا کر رضائی میرے اوپر اس طرح ڈالدی گویا بچھونا رکھا ہے۔ اور نوکر کو سونے کی بالیاں اُتار کر دیں کہ یہ گامی کو دیدو اور کہدو کہ میرے بچّہ کی مخبری نہ کرے۔ میرزا صاحب کہتے ہیں کہ میں شام

تک اسی طرح پڑا رہا۔

اُن کا یہ بیان بھی قابل تحریر ہے کہ ہم لوگ بادشاہ کے آنے سے پہلے درگاہِ سلطان جی صاحب میں آگئے تھے۔ جب خبر ملی کہ بادشاہ مقبرۂ ہمایوں میں آگئے ہیں تو میں نوکر کے ساتھ والدہ کے کہنے کے بموجب اُن کو سلام کرنے گیا۔ بہادر شاہ اُس وقت ہمایوں کی قبر سے تکیہ لگائے بیٹھے تھے، میں نے جاکر سلام کیا تو گھبراکر فرمایا "بھئی اماں! تم یہاں کہاں؟ لو یہ تمھارے خوان کے روپے ہیں۔ لو، اور ابھی چلے جاؤ۔ جیتے بچے تو پھر ملیں گے"۔

مجکو بادشاہ کے ہاں سے کھانے کا خوان ملا کرتا تھا، اسکے عوض بادشاہ نے پانچ روپے مجکو دیے اور رخصت کردیا۔

میرزا قویاش کی تلاش

میرزا ابلاقی صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ جب خوف زیادہ بڑھا تو والدہ ہم سب کو لیکر رتھ میں سوار ہوئیں اور قطب صاحب لے چلیں، ہم راستہ میں تھے کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز آئی، اور تھوڑی دیر میں سواروں نے ہمارے رتھ کو گھیر لیا۔ ایک آدمی نے پردہ کے سوراخ میں مُنہ ڈال کر جھانکا تو اماں بولیں، کون ہے؟ زنانہ میں کیوں جھانکتا ہے؟ تو جواب ملا۔ میں ہوں میرزا الٰہی بخش۔ رتھ کے اندر میرزا قویاش تو نہیں ہیں؟ اماں نے کہا:۔ ہوش کی خبر لو۔ میرزا قویاش یہاں کہاں؟ میرے بچے اس رتھ میں ہیں۔ اس کے بعد۔ ہڈسن صاحب نے جو رتھ کی دوسری طرف کھڑے تھے اپنے کوڑے سے رتھ کا پردہ اُٹھایا، اور میری کوک میں اپنے کوڑے کی نوک لگائی۔ میں خوف سے کانپنے لگا، مگر جب اُن کو معلوم ہوگیا کہ میرزا

قو یاش رتھ کے اندر نہیں ہیں تو وہ گھوڑے دوڑاتے ہوئے قطب صاحب کی طرف چلے گئے۔

سواروں میں ایک ہڈسن صاحب تھے، اور ایک میرزا الٰہی بخش اور دو میرزا صاحب کے اردلی بجو خاں وغیرہ تھے۔

جب وہ آگے بڑھ گئے تو ہمارا رتھ بھی روانہ ہوا، تھوڑی دور گئے تھے کہ سڑک کے مغربی رُخ جنگل میں میرزا قویاش کو گھوڑے پر سوار کھڑا دیکھا۔ اُن کے سر پر ٹوپی نہ تھی اور چہرہ پر خاک پڑی ہوئی تھی، اور بڑے گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اور جس گھوڑے پر سوار تھے وہ بہت ہی معمولی درجہ کا معلوم ہوتا تھا، مرزا قویاش نے رتھ کو دیکھا اور مجھ کو پہچانا تو قریب آئے۔ والدہ نے اُن سے فرمایا، میرزا خدا کے لئے جلد بھاگ، تیری تلاش میں ہڈسن صاحب اور میرزا الٰہی بخش ابھی قطب صاحب گئے ہیں تھوڑی دیر میں اُلٹے آتے ہوں گے اس راستہ سے نہ جانا کسی اور طرف جانا۔

میرزا قویاش یہ سُنکر اور گھبرا گئے اور سلام کر کے گھوڑا ایڑھا کر جنگل میں چلے گئے اور پھر آج تک اُن کا پتہ نہ لگا کہ وہ کہاں گئے۔ (میرزا ابلاقی صاحب کا بیان ختم ہوا)۔

تین دن کی لُوٹ

قبضۂ دہلی کے بعد تین روز تک فوجی سپاہیوں کو دہلی کی لُوٹ معاف رہی جنھوں نے اچھی طرح پیٹ بھر کر جس قدر لوٹا جا سکا لوٹا۔ ان سپاہیوں میں بعض ایسی اقوام کے لوگ تھے، جن کا لوٹ کھسوٹ خاندانی پیشہ تھا۔ اس واسطے وہ مال رکھنے کی جگھوں کو بہت اچھی طرح پہچانتے تھے، جب وہ گھروں کے اندر

جاتے تو تمام دیواروں کو ہاتھوں سے ٹھپک ٹھپک کر دیکھتے تھے، کیونکہ اُن کو معلوم تھا کہ اکثر لوگ دیواروں کے اندر روزن بنا کر اُس میں زیور اور روپیہ رکھدیتے ہیں، اس لئے جہاں کہیں سے دیوار کے اندر کھوکھلے پن کی آواز آتی وہ اُس کو کھودتے اور زیور روپیہ وغیرہ نکال لیتے، وہ یہ بھی جانتے تھے کہ لوگ زمین کے اندر دولت کو دفن کر دیتے ہیں اس واسطے وہ گھروں میں آکر جگہ جگہ پانی بہاتے اور جہاں دیکھتے کہ پانی جذب ہوگیا، اُسی مقام کو کھود کر روپیہ پیسہ نکال لیتے تھے۔ تین روز کے بعد فوج کی درخواست پر حکام نے

پرائز ایجنسی

کے نام سے ایک محکمہ قائم کیا جسکا یہ کام قرار پایا کہ تین دن کی لوٹ کے بعد شہر میں اور جو کچھ مال و دولت باقی ہو وہ جمع کرا کے اس محکمہ کے ذریعہ نیلام یا فروخت کرایا جائے اور وہ روپیہ فوج کو تقسیم کر دیا جائے۔

پرائز ایجنسی کے قائم ہونے سے عام لوٹ مار تو بند ہوگئی لیکن پوری طرح اس کا سدِ باب نہ ہوا۔ شہر کے دروازے بند کر دیے گئے تھے، تاکہ سپاہی لوٹ کا مال باہر نہ لیجا سکیں، تاہم سپاہی رسیاں باندھ باندھ کر فصیل کے نیچے اُتر جاتے تھے، آدھے فصیل کے نیچے کھڑے رہتے، آدھے لوٹ کا مال رسیوں میں باندھ باندھ کر باہر اُن کو پہنچاتے رہتے۔

گوروں نے بالکل نہیں لوٹا

منشی ذکاءاللہ صاحب نے لکھا ہے کہ اس لوٹ مار میں صرف پنجابی اور سرحدی اور سکھ قومیں شریک تھیں، گورے اور ہندوستانی سپاہیوں نے لوٹ

کے مال کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

پرائز ایجنسی کا کام یہ تھا کہ اس نے اپنے ماتحت کئی قسم کے عہدہ دار قائم کئے تھے، کوئی عہدہ دار صرف کتابوں کو جمع کرتا تھا، کوئی برتنوں، چارپائیوں اور چکیوں کو، کوئی دفینوں کو کھدواتا تھا، دفینوں کی کھدوائی کے لئے انھوں نے یہ حکمت کی تھی کہ راج مزدوروں کو کمیشن دینے کا لالچ دے کر اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ تہہ خانے اور دفینے عموماً راج مزدوروں کے ذریعے تیار ہوئے تھے۔ اس واسطے پرائز ایجنسی کو بہت آسانی کے ساتھ تمام دفینے دستیاب ہو گئے۔

یہ تمام مال و اسباب مختلف مقامات پر گوداموں میں بھرا جاتا تھا منصور خاں کی حویلی میں شہر کے اندر تانبے اور پیتل کے برتن رکھے جاتے تھے، پروفیسر رامچندر کی کوٹھی میں کتابیں جمع کی جاتی تھیں۔

کھدائی سارے شہر میں ایسی ہوئی کہ پہلے زمانہ کے روپئے اور اشرفیاں بھی گڑی ہوئی نکل آئیں، کہتے ہیں کہ نواب محمد میر خاں کے مکان میں سے ساٹھ ہزار روپئے کا ایک دفینہ ایسا نکلا جسکا حال گھر والوں کو بھی معلوم نہ تھا۔ یہ روپئے دیک کے سکہ کے تھے۔

پرائز ایجنسی کو ان طریقوں کے علاوہ ایک اور طریقہ سے بھی بہت سا روپیہ حاصل ہوا اور وہ یہ تھا کہ بڑے بڑے امیروں کو جاں بخشی کی سندیں خاطر خواہ روپیہ لے کر دی جاتی تھیں۔ مشہور ہے کہ نواب حامد علی خاں اور مفتی صدرالدین خاں اور مکند لال مصرنے اس طرح زر کثیر دے کر اپنی جانیں بچائی تھیں، ایک صاحب بہادر شاہ کے بیٹے جواں بخت کو ہاتھی کی عماری پر بٹھا کر لال کنوئیں کے قریب جواں بخت کی ماں زینت محل کے محل میں لے گئے اور اُن سے زینت محل کے مال کا پتہ پوچھکر اُس کو وہاں سے نکال لیا۔ مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ صاحب بہا

کون تھے اور یہ روپیہ اُنھوں نے خود رکھا یا پرائز ایجنسی کو دے دیا۔ بعض آدمی کھانے پینے سے ایسے محتاج ہو گئے تھے کہ اُنھوں نے خود اپنا مال پرائز ایجنسی کے کارندوں کو بتایا تاکہ اس طرح کمیشن اُن کو مل جائے۔ بعض ناخلف بیٹوں نے ماں باپ کا بعض نے اپنے عزیزوں کا مال بتانے میں حصّہ لیا۔ ایک صاحب کا کام یہ تھا کہ شہر کے محلوں اور بازاروں اور بڑی حویلیوں کے دروازوں کو اُکھیڑتے اور جمع کر کے اُن میں آگ لگا دیتے اور دوسرے دن راکھ کے ڈھیر میں سے جس قدر لوہا پیتل نکلتا اُس کو اُٹھوا کر لیجاتے۔

ایمان دار فوجی مُسلمان

بعض ایماندار فوجی مسلمان ایسے تھے کہ وہ مسلمانوں کے گھروں کو لوٹنا گناہ جانتے تھے، وہ مسلمانوں کے گھروں میں سے صرف قرآن شریف کو لے لیتے اور جس جگہ قرآن کو بُری طرح پڑا ہوا دیکھتے تو چشم پر آب ہو کر پہلے اُس کو چومتے اور پھر اُٹھا کر لے آتے۔

ایک مسلمان افسر نے جو دہلی کی مشہور جامع مسجد میں فوج کے ساتھ رہتا تھا، جامع مسجد کے کُل تبرکات اور ہزار بارہ سو روپے کی چاندی کی کشتی جسمیں یہ تبرکات رکھے جاتے تھے، درگاہ شریف کے تہ خانہ میں سے لے کر وہاں کے خادموں کو دیدیے جو آج تک اُن کے پاس موجود ہیں۔

ہندوؤں پر جُرمانہ

جب پرائز ایجنسی کے ہاتھ اور طریقوں سے روپیہ آنا بند ہو گیا تو اُنھوں نے ہندوؤں سے جرمانہ وصول کر کے محلوں میں آباد کرنا شروع کیا۔ جُرمانہ کی

مقدار کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ صرف نیل کے کٹڑہ کے باشندوں سے ۵۰ ہزار روپیہ لیا گیا تھا، حالانکہ اس محلہ نے لڑائی میں شرکت نہ کی تھی،

لیکن تاوان جنگ لے کر صرف ہندو آباد کیئے جاتے تھے، مسلمانوں کو مارچ ۱۸۵۹ء تک شہر میں آباد ہونے کی اجازت نہ تھی۔

مسلمانوں کو آباد ہونے کی اجازت

آخر مارچ ۱۸۵۹ء میں خدا کا نیک بندہ سرجان لارنس دہلی میں آیا اور اُس نے مسلمانوں کو بھی شہر میں آباد ہونے کی اجازت دی، سنہری مسجد میں منشی دیوکی نندن چوکیدارہ کے بخشی آنکر بیٹھے اُن کے پاس چوکیدارہ کا رجسٹر تھا جس میں مکانات کے مالکوں کے نام درج تھے، اُسکے مطابق مسلمانوں کو اپنے اپنے گھروں میں آباد ہونے کے لئے سرٹیفکٹ تقسیم کئے گئے، اور اس کے ساتھ یہ بھی حکم ملا کہ ڈیڑھ روپیہ دے کر دو چارپائیاں اور ایک چکی مول لے لیں۔ اس طرح پرائز ایجنسی کے پاس جو بے شمار چارپائیاں اور چکیاں جمع تھیں وہ چند روز میں فروخت ہوگئیں۔

جب مسلمان اپنے گھروں میں آباد ہوئے تو مکانوں میں نہ کوئی اسباب تھا اور نہ کواڑ تھے، کیونکہ وہ بھی بڑی بے دردی سے ایندھن کی جگہ جلا دیے گئے تھے، مسلمانوں کی تباہی کا کچھ ٹھکانا نہ تھا، غدر کے ایک برس بعد یعنی ۱۸۵۸ء میں مسلمانوں کی آبادی کا تخمینہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ سابقہ آبادی کے مقابلہ میں ایک چوتھائی بھی نہ تھے۔

۱۸۵۹ء تک مسلمانوں کے خاص مکانات سرکاری ضبطی میں رہے اور مسلمان شہر کے اندر بغیر کسی افسر کے پاس کے چل پھر نہیں سکتے تھے۔

دہلی کی جامع مسجد

دہلی فتح ہوئی تو مسلمان سپاہی ہندوؤں کے مندروں میں گھس گئے اور اُنکو خراب کر ڈالا، اور ہندو سپاہیوں نے مسجدوں کو خراب کیا، دہلی کی بڑی جامع مسجد میں سکھ سپاہیوں کی بارگ بنائی گئی تھی، پاخانے اور پیشاب خانے بھی اسی کے اندر تھے، میناروں کے نیچے حلوے پکائے جاتے تھے، اور سوٗر بھی ذبح ہو کر پکتے تھے، کُتّے جو انگریزوں کے ساتھ تھے اندر پڑے پھرتے تھے۔

زینت المساجد کو گوروں کا مسکوٹ گھر بنایا گیا تھا۔ شیعوں کی مشہور مسجد جو نواب حامد علی خاں کی مسجد کہلاتی تھی اُس میں گدھے باندھے جاتے تھے۔

قلعہ کے نیچے ایک بڑی عالی شان مسجد اکبر آبادی بالکل مسمار کردی گئی اور اسی طرح اور بہت سی چھوٹی چھوٹی مسجدوں کا خاتمہ ہوا۔ کوتوالی کے قریب سکھوں کے گُردوارہ سے چپیاں ایک مسجد تھی، اُس کے ملنے کی درخواست مہاراجہ جنید نے سرکار سے کی اور وہ اُس کو سرکار نے دیدی۔ مہاراجہ نے اُس مسجد کو توڑا، اور گوردوارہ میں ملا دیا۔ چنانچہ وہ اب تک گوردوارہ کے اندر شامل ہے یہ تمام حالات تاریخ ہند کے صفحہ ۱۵، سے صفحہ ۱۷، تک میں موجود ہیں، جو سنہ ۱۹۰۷ء میں شمس المطابع دہلی نے چھاپی ؛

دہلی کے ہندو کیونکر امیر ہوئے؟

گو مسلمان سود لینے کو حرام سمجھتے تھے، مگر پرامیسری نوٹوں کے سود لینے کو بعض سُنّی مسلمان اور کل شیعہ علی العموم حلال جانتے تھے، ان کے پاس پانچ سات لاکھ روپئے کے پرامیسری نوٹ تھے، جب غدر ہوا تو مسلمانوں کو یقین

تھا کہ اب انگریزی عملداری پھر نہیں آئے گی، اس لئے انھوں نے ان نوٹوں کو ۵۴ روپئے سیکڑہ کے حساب سے بیچڈالا اور ہندوؤں کو یقین تھا کہ انگریزی عملداری پھر قائم ہوگی اس لئے اُنھوں نے یہ نوٹ خرید لئے اور اس طرح ہندوں کو کئی لاکھ روپئے مل گئے۔

مسلمانوں کا سارا اسباب جو پرائز ایجنسی نے جمع کیا تھا وہ زیادہ تر ہندوں نے نیلام میں بہت ارزاں خریدا اور اس مال و اسباب کی دُکانیں کھولکر خوب روپئے کمائے۔

باغی مُسلمانوں کے جو مکانات ضبط ہوکر نیلام ہوئے وہ سب کے سب ہندوؤں نے بہت سستے داموں میں خرید لئے۔ جن کی قیمت اب پچاس گنی سے بھی زیادہ ہوگئی ہے۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے مشہور مکانات جیسے کلاں محل مرزا خجستہ بخت کی حویلی، جھجر والوں کی کوٹھی، شیش محل، نواب منصور خاں کی حویلیاں جو ایک ایک محلہ کی برابر تھیں، وہ سب ہندوؤں نے خریدیں۔

جن محلوں میں غدر سے پہلے ہندوؤں کی ملکیت ایک مکان بھی نہ تھا، غدر کے بعد اُن محلوں میں زیادہ مکانات کے مالک ہندو ہو گئے، مسلمانوں نے اپنی ضرورتوں کے سبب بچا کھچا، گڑا و بازیور بہت سستے داموں ہندوں کے ہاتھ بیچا، وہ بارہ آنہ تولہ چاندی لیتے تھے اور چودہ پندرہ روپئے تولہ سونا غرض دہلی کا غدر مسلمانوں کے لئے تباہی کی دیوی لایا تھا اور ہندوؤں کے واسطے لکشمی۔

گورنمنٹ کے خیر خواہوں کو انعام

سرکار نے اُن انگریزوں کو جن کا اسباب باغیوں نے لوٹا تھا اور اُن ہندوستانی

خیر خواہوں کو جن کا اسباب انگریزی خیر خواہی کے سبب لوٹا گیا تھا بڑی شاہانہ فیاضیوں کے معاوضے عطا کئے۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپئے مرزا الٰہی بخش کو عطا ہوئے۔ نواب امین اللہ خاں عرف منشی عمو جان کو جو ریاست الور میں سرکار کے خیر خواہ رہے پندرہ ہزار روپیہ دیا گیا۔ اسی طرح اور بہت سے لوگوں کو۔

دہلی میں مسلمان عورتوں کی مصیبت

جب ہزارہا مسلمان مارے گئے تو اُن کی لاوارث بیویاں کنواری بیاہی لڑکیاں اور بہنیں اور مائیں بے سہارے رہ گئیں، ان میں بہت سی عورتوں نے انگریزی فوج کے مسلمانوں سے شادیاں کرلیں، اور بعض نے بدچلنی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ بہادر شاہ کی ایک بیٹی ربیعہ بیگم نے روٹیوں سے محتاج ہونے کے سبب دہلی کے مشہور حسینی باورچی سے شادی کرلی۔ بہادر شاہ کی ایک دوسری بیٹی فاطمہ سلطان پادریوں کے زنانہ اسکول میں معلمی کا پیشہ کرنے لگیں۔ صدہا عورتوں نے اپنے بال جوؤں کی شدت سے کٹوا ڈالے اور سر منڈوا دئے۔ ہزاروں شریف عورتیں بھیک مانگنے لگیں۔ اگر کوئی شخص ایک ایک خمیری روٹی یا ایک ایک مٹھی چنے یا کوڑیاں تقسیم کرتا تو مسلمان عورتوں کے غول کے غول جمع ہوجاتے تھے، یہ وہ عورتیں تھیں جو سال دو سال پہلے خود ہزاروں روپیہ کی خیرات اپنے گھروں میں بیٹھ کر کرتی تھیں، دہلی کے مفتی اعظم مفتی صدرالدین خاں آزردہ نے ایک نظم میں اُس وقت کی دہلی کا حال اس طرح لکھا ہے۔

آفت اس شہر میں قلعہ کی بدولت آئی
وہاں کے اعمال سے دلّی کی بھی شامت آئی

روز موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

گوش زد تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جو سُنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اہل نااہل سے مطلب اُنھیں زنہار نہ تھا

ان کی خلوت سے کوئی واقفِ اسرار نہ تھا
آدمی کیا ہے فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے تھے پریشاں دربدر

خاک بھی ملتی نہیں اُن کو کہ ڈالیں سر پر

اسی طرح جناب نواب مرزا صاحب داغ دہلوی نے ایک بڑی نظم لکھی ہے جس کا اقتباس درج ذیل کیا جاتا ہے:۔

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا

یہ پوربئے نہیں آئے خدا کا قہر آیا

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعین
جو ماتا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دین

یہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہے دینِ متین
کئے تھے قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسین

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا

غرض وہ کام کیا، کام ہی تمام کیا

جلی ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ نواب محمد اسحاق خاں مرحوم کے والد لکھتے ہیں:۔

دلّی اب ہی تنِ بیجاں، تنِ بیجاں کیا خاک

جان سے جا چکے جو لوگ تھے جانِ دہلی

غمناک سماں

سر جان لارنس کی لائف میں قلعہ دہلی کا ایک غمناک سماں کسی انگریز نے

لکھا ہے جسکو یہاں درج کیا جاتا ہے:۔

"ایک بڑے سلسلۂ خاندانِ شاہی کے آخری بادشاہ کی عالی شان غلام گروشیں اور شاہانہ خلوت سرا عوام الناس کی نگاہ کے روبرو کھلی ہوئی تھیں۔ اور مسلح آدمی جو دوسروں کے نوکر تھے اُس کے آس پاس جمع تھے، بے چارہ بوڑھا بادشاہ جو بمجبوری باغیوں کے ہاتھ کی کٹھ پتلی بنا تھا، اپنے محل سے نکالا ہوا ایک علیٰحدہ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، اور اُس کے پھانسی دینے کی تجویزیں ہو رہی تھیں، وہ افسروں اور سپاہیوں کی گالیاں اور گھڑکیاں سُن رہا تھا، شہنشاہ بیگم اُس کی آڑ میں اپنے جسم کو چھپاتی تھیں، تاکہ کسی نامحرم یا ظالم کی نظر نہ پڑ جائے۔"

سر جان لارنس کی لائف میں دوسری جگہ لکھا ہے کہ گوروں نے دل لگی کے طور پر قلعہ کے لاہوری دروازہ کے سامنے بہادر شاہ کی تصویر بنائی اور تصویر کو پھانسی پر چڑھایا۔

سر جان لارنس کی لائف لکھنے والا لکھتا ہے کہ ایک شخص نے دہلی کا چشمدید حال مجکو ان الفاظ میں تحریر کیا:۔

"کوسوں تک بجز ایک فاقہ زدہ بلّی کے اور ایک پوری مصیبت کی ماری عورت کے جو گودڑ سمیٹتی پھرتی تھی کوئی آدمی نظر نہ آیا، کالج کی عمارت میں یورپین توپ خانہ نصب تھا۔ جامع مسجد جو تمام ہندوستان میں بے نظیر ہے سکھوں کی فوجی بارگ تھی، اور ماشل لا جاری تھا۔"

سر جان لارنس کی رحمدلی

ایک طرف یہ ہولناک مصائب تھے جن کا بیان کیا گیا۔ دوسری طرف ایک

انگریز کی رحمدلی کام کر رہی تھی جس کا تذکرہ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔
سرجان لارنس کی رحمدلی کا ثبوت ان خطوط سے ہو گا، جو ذیل میں درج کئے جاتے ہیں
شہزادوں کی نسبت ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"ان کی اچھی طرح تحقیقات کرو، اگر وہ انگریزوں یا اُن کی عورتوں اور بچوں کے قاتل ہوں یا اُن کے قتل کے معاون ہوں تو اُن کو موت کی سزا دو لیکن کسی شہزادہ کے ساتھ اس طرح پیش نہ آؤ جس طرح ہڈسن صاحب اپنے کشتوں کے ساتھ پیش آئے"۔

سرجان لارنس کے اس خط میں آخری فقرہ خاص طور سے قابل غور ہے سوچنا چاہئے کہ ہڈسن صاحب اپنے کشتوں کے کس طرح پیش آئے۔ کیونکہ اس کا ذکر تاریخوں میں کہیں نہیں پایا جاتا، سوائے اُن زبانی بیانات کے جن میں مقتول شہزادوں کا خون پینے اور اُن کا سر کاٹ کر بادشاہ کے سامنے پیش کرنے کا حال ہے۔
سرجان لارنس کی اس تحریر سے اُن زبانی بیانات کی صداقت پر روشنی پڑتی ہے۔

نواب جھجر اور راجہ بلب گڑھ کی نسبت لکھتے ہیں:۔

"اُن کو اپنی جنگی صولت جو خوں فشانی سے خالی ہو دکھا کر مطیع کرو، اور ان کے ساتھ انصاف کرنے کا وعدہ کرو"۔

سرجان لارنس کی اس تحریر پر عمل نہیں کیا گیا۔ انھوں نے خون بہانے سے روکا تھا، مگر ان دونوں کو پھانسیاں دیدی گئیں۔

پھر ۲۶ ستمبر کو جنرل ولسن کے نام لکھتے ہیں:۔

"میں نہیں خیال کرتا کہ اگر شہر کے باشندے اپنے گھروں میں واپس آجائینگے تو آپ کو اس بات کا خوف پیدا ہو گا کہ دہلی پر کسی طرف سے حملہ ہو جائے گا، کیونکہ ہماری ۵۰ برس کی حکومت کے عرصہ میں کبھی انھوں نے سرتابی نہیں کی، اگر ہماری

اپنی فوج نے غدر نہ مچایا ہوتا تو وہ اور ۲۰ برس تک خاموش رہتے، میں ان تمام مصائب سے قطع نظر کر کے جو باشندگانِ دہلی کو پیش آئے۔ یہ کہتا ہوں کہ اگر کشمیری دروازہ پر چند سر لٹکا دیے جائیں تو پھر کسی طرح کا خوف و خطر نہیں ہے۔"

دہلی کے فتح ہونے کے دس روز بعد ۳۰ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو اُنھوں نے مسٹر برن فوجی گورنر دہلی کے نام یہ خط لکھا:-

"شہر کے باشندوں کی نسبت میری یہ رائے ہے کہ جب قلعہ کی محافظت کا بندوبست خاطر خواہ ہو جائے تو اُن کو رفتہ رفتہ احتیاط کے ساتھ شہر میں واپس بلا لینا چاہیئے۔ شہر کے ڈرانے کے لئے چاندنی چوک کے سامنے جو پھاٹک ہے اسپر توپخانہ کے لگانے سے سب طرح اطمینان رہیگا۔ باغیوں کے جو سرغنہ ہیں اُن کو پھانسی دی جائے، مگر اور لوگوں کے ساتھ نرمی برتنی چاہیئے۔ ۹۰ فی صدی باشندوں کو اس غدر سے کچھ علاقہ نہ تھا، اگر اُن سے ہوسکتا تو وہ ہماری مدد کرتے۔ ہم خود اپنی حماقت اور کمزوری کے سبب ان کی حفاظت نہ کر سکے۔ ورنہ ان کو مجبور کر کے بغاوت میں شریک نہ کیا جاتا۔"

چارلس سانڈرس صاحب کمشنر دہلی کو ۶ر اکتوبر کے خط میں لکھا:-

"مناسب شرطوں کے ساتھ شہر کے تمام باشندوں کو واپس بلا لینا چاہیئے اب سب سے زیادہ تکلیف عاجز و بے قصور باشندوں ہی کو ہے۔"

نیول چیمبرلین کے نام ۸ر اکتوبر کو لکھتے ہیں:-

"میں کسی طرح اس بات کی صلاح نہیں دیتا کہ شہزادے یا اس قسم کے مفسد بلا تحقیقات قتل کئے جائیں، ان کو تحقیقات کا موقع دینا چاہیئے۔ بوڑھا بادشاہ اگر بھاگ گیا ہوتا تو اس کو گولی سے اُڑانا واجب تھا لیکن جبکہ وہ بھاگا نہیں تو میں رائے نہیں دیتا۔ میری رائے ہے کہ بادشاہ نے مقتضائے وقت کے موافق کام کیا۔"

جامع مسجد کو ڈھادو یا گرجا بنادو

دہلی کے اکثر انگریز یہ چاہتے تھے کہ جامع مسجد کو ڈھا دیا جائے، یا اس کو گرجا بنادیا جائے، اور سنگ مرمر کے مصلوں پر اُن انگریزوں کے نام کندہ کئے جائیں جو غدر میں مارے گئے تھے، اس معاملہ میں ہر انگریز کو اصرار تھا کہ جامع مسجد کو گرجا بنانا یا توڑنا بہت ہی ضروری ہے، کیونکہ یہ مسجد ہندوستان کے مسلمانوں کا مذہبی دل ہے۔ اس کے مسمار کرنے یا گرجا بنانے سے تمام مسلمانانِ ہندوستان کے دل پر ضرب پڑے گی جس کی اظہارِ غلبہ و اقتدار کے لئے سخت ضرورت ہے۔ اس واسطے سر جان لارنس کے پاس بکثرت تحریریں جاتی تھیں اور ان کو جامع مسجد کے فیصلہ کے لئے مجبور کیا جارہا تھا، چنانچہ برن صاحب کے جواب میں سر جان لارنس نے لکھا:-

"اس باب میں میں کسی طرح رضامند نہیں ہونگا، مذہبی عمارتوں کے انہدام سے ہم کو احتراز کرنا چاہئے۔ یہ کام نہ دوستوں کی خوشی کے لئے مناسب ہے، نہ دشمنوں کی آزادی کے لئے زیب دیتا ہے"

بہت سے انگریز کہتے تھے دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادینی چاہئے اور جامع مسجد کو تو گرجا بنانا بہت ہی ضروری ہے۔ اس کے میناروں پر صلیب لگائی جائے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ "جو انگریز مسجد کو دوبارہ مسلمانوں کے حوالہ کردینا چاہتے ہیں وہ پاگل ہوگئے ہیں"۔ جامع مسجد کے معاملہ میں ذی اختیار انگریزوں کا اصرار حد سے بڑھ گیا جس میں دہلی اور پنجاب کے تمام انگریز شامل تھے۔ یہاں تک کہ وہ خود سر جان لارنس کے پاس گئے اور اُن کو مجبور کیا کہ جامع مسجد کے معاملہ میں آپ کو ہمارے موافق رائے دینی چاہئے، تو سر جان نے بہت

نرمی سے دلیلیں بیان کرنی شروع کیں، اور جامع مسجد کو توڑنے یا گرجا بنانے کی مخالفت کی لیکن جب اس نرمی اور دلیل بازی کا انگریزوں پر کچھ اثر نہ ہوا تو وہ غضبناک ہو کر کھڑے ہو گئے، اور انھوں نے کہا:۔

"میں یہ رائے ہرگز نہ دونگا، بہت سے ایسے اُمور ہیں جنکے لئے تم اصرار کر سکتے ہو لیکن جامع مسجد کے بارے میں مجھ سے کبھی اصرار نہ کرنا۔ مناسب یہی ہے کہ مجھے اس معاملہ میں مجبور کرنے کی تکلیف نہ دی جائے۔"

لارڈ کیننگ کو لکھتے ہیں۔ اُس وقت جبکہ دہلی میں پرائز ایجنسی کی لوٹ مار جاری تھی:۔

"اگر جناب اس کو شہر کی حیثیت سے قائم رکھنا چاہتے ہیں تو میرے نزدیک پرائز ایجنسی کی کارروائیوں کو روکنا چاہیئے، جب تک ہندوستانی باشندوں کے جان و مال کی محافظت نہیں کی جائے گی تب تک امن و امان کا قائم ہونا دشوار ہے جو لوٹ مار اس وقت برابر ہو رہی ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام ہندوستانی آشفتہ و برہم ہو جائیں گے اور ہمارے اور اُن کے درمیان اس وقت جو رخنہ پڑا ہوا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اور کشادہ ہو جائے گا۔"

اسی زمانہ میں اُنھوں نے لارڈ الفنسٹن کو لکھا:۔

"اگر دہلی میں مارشل لا اور پرائز ایجنسی موقوف کر دی جائے تو بخوبی اصلاح ہو سکتی ہے۔"

پھر اسی زمانہ میں جنرل پینی کو بڑے زور کے ساتھ لکھتے ہیں:۔

"اگر ہم سے اعلیٰ و دماغی کارروائیاں نہیں ہو سکتی ہیں تو بھی معمولی پالیسی کے اعتبار سے ہم پر لازم ہے کہ اپنے ہم وطنوں کو ظلم و تعدی سے باز رکھیں۔ اگر ہم سزا دینے میں دوست دشمن کی تمیز نہ کریں گے تو تمام ہندوستان ہمارا مخالف ہو جائے گا، اور مُلک کے گوشہ گوشہ میں ہم سے لڑائیاں شروع ہو جائینگی۔

اور جب ہندوستان اس قدر گرم ہوگیا تو ہمارا اس ملک میں رہنا دشوار ہو جائیگا۔"

اس خط کا بہت اچھا اثر ہوا۔ چنانچہ اس کے ایک ہفتہ کے بعد جنرل ہینی کو لکھتے ہیں:

"میں آپ کا بہت ممنون ہوں کہ آپنے لوٹ مار کے روکنے میں بہت جلد کارروائی کی۔ مجھے اس بات کے سننے سے نہایت افسوس ہوا کہ ہمارے ملک کے لوگ بے سبب ہندوستانیوں کو مار ڈالتے ہیں، حالانکہ ان کو اس کے اختیارات نہیں ہیں کہ مجرم و بے جرم لوگوں میں سزا دیتے وقت کچھ تمیز نہ کریں۔"

جب اُنھوں نے دیکھا کہ میرے لکھنے کا افسران دہلی پر اثر نہیں ہوتا تو وہ خود ۲۴ر فروری ۱۸۵۸ء کو دہلی میں آئے اور یہاں آکر پہلا کام اُنھوں نے یہ کیا کہ دہلی کے تمام خاص خاص افسروں کو اپنے پاس بُلایا۔ جن میں چارلس سانڈرس خلیپ ایجرٹن۔ نیول چیمبرلین وغیرہ بھی تھے، اور اُن کو مخاطب کرکے نہایت نرمی سے حسب ذیل تقریر کی:۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ خاص خاص حالتوں میں شر و فساد روکنے کے لئے خاص تدبیریں جائز تھیں، لیکن اب ان تدبیروں کا زمانہ گزر گیا، اب تو اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندوستانیوں میں امن و امان قائم کیا جائے اور اُن کے دلوں میں اپنا اعتماد جمایا جائے۔"

اس کے بعد ہی اُنھوں نے لارڈ کیننگ کو تار دیا جسکے الفاظ یہ تھے:۔

"جن افسروں کو پھانسی دینے اور رہا کرنے کا اختیار دیا گیا تھا اُنھوں نے اپنے اختیار کو بُری طرح استعمال کیا، لہذا مجھ کو ان کے اختیارات سلب کرنے کی اجازت عنایت فرمائیے، تاکہ گورنمنٹ کی منظوری کے بغیر کوئی کسی کو موت کی سزا نہ دے سکے۔"

دہلی میں ان کے بڑے عزیز سکریٹری رچرڈ ٹمپل آگئے تھے، اُنھوں نے حالات

کا مشاہدہ کر کے ان کے پاس حسب ذیل رپورٹ بھیجی :-

"شہر میں بالکل امن وامان ہے، خوف کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، لیکن لوٹ مار و خونریزی اب تک جاری ہے، ہندوستانیوں کے رنگ فق ہیں وہ اب بھی کثرت سے گرفتار ہوتے ہیں اور اکثر پھانسی پاتے ہیں یا قید کئے جاتے ہیں:"

غرض وہ مارچ کے تیسرے ہفتہ میں دہلی سے روانہ ہو گئے، اور مسلمانوں کو شہر میں آنے کی اجازت دے گئے، اور جنرل کمانیر کو مسلمانوں کی محافظت کی سخت تاکید کر گئے، جامع مسجد مسمار نہیں ہوئی۔ شہر کے باشندے جلاوطن نہیں کئے گئے، اور یہ خواہش پوری نہیں ہوئی کہ دہلی کی تاریخی یادگاروں پر ہل چلا دیا جاتا ایک انگریز لکھتا ہے :-

"جس طرح روم کے قیصروں نے شہر "کارتھیج" اور "کورنتھ" کو مسمار کر کے لعنت کے طوق اپنی گردنوں میں ڈالے تھے، اسی طرح انگریزوں کی گردنوں میں بھی دہلی کو مسمار کر کے ہمیشہ کے لئے وہ لعنت کے طوق پڑ جاتے مگر سر جان لارنس نے اس دوامی بدنامی سے انگلش قوم کو بچا لیا۔ جب ان کے آس پاس بیٹھنے والے ان کو سختی پر مجبور کرتے تو وہ کہتے تھے، کیا میں ہندوستانیوں کو مار ڈالوں؟ کیا میں اس شہر کو جو نینوا کے مقابلہ کا ہے نہ بچاؤں؟" ایک دوسرا انگریز لکھتا ہے :-

"انگلش قوم میں اور کل شہنشاہی اقوام میں ایک فرقہ ایسا ہوتا ہے جسکی صورت تو انسانوں کی سی ہوتی ہے اور سیرت درندوں کی۔ انکا میلانِ طبع یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ممکن ہو مغلوب قوم کو خوف زدہ کیا جائے۔ اگر سر جان لارنس نہ ہوتے تو دہلی کی جامع مسجد ایک ٹوٹا ہوا ڈھیر ہوتی، جس میں جانوروں کے بلوں اور گھونسلوں کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔"

رنگون میں بہادر شاہ قید کے آخری سانس لے رہے ہیں
ناک کا بانسہ پھر گیا ہے - کوئی مونس و ہمدم مرنے والے شہنشاہ کے پاس
نہیں ہے - سکرات و جانکنی طاری ہے - چند منٹ کے بعد
خاتمہ ہو جائیگا - یہ اصلی تصویر ہے جو
مرنے کے وقت لی گئی تھی۔
اے ہندوستان میں دنیا سے جاتا ہوں
اور اب تجھکو خدا کے سپرد کرتا ہوں - جس نے
آج تیموری سلطنت کے چہرہ پر موت کا پردہ
ڈھک دیا
حسن نظامی نے
لکھا

۲۵ نومبر کو لارڈ الفنسٹن گورنر بمبئی نے سر جان لارنس کو لکھا:۔

"دہلی فتح ہونے کے بعد دوست دشمن میں کچھ تمیز نہیں کی گئی۔ دہلی میں نادر شاہ کے وقت سے بھی زیادہ لوٹ ہوئی"۔

سر جان لارنس نے جو رپورٹ گورنمنٹ ہند کو بھیجی تھی اُس میں ایک یہ فقرہ ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیسے خدا پرست تھے:۔

"ہمارے اور باغیوں کے سر پر ایک عادل فرمانروا ہے، اُسی کے فضل وکرم سے یہ آئی ہوئی بلا ٹلی ہے، پس جب خدا نے ہم پر رحم کیا۔ ہم کو بھی اُس کے بندوں پر رحم کرنا چاہئے"۔

بہادر شاہ کا انجام

قصہ مختصر سر جان لارنس کی کوشش سے بہادر شاہ کو جان سے نہیں مارا گیا۔ بلکہ چند روز ایک مقدمہ کی کارروائی کر کے اُن کو رنگون بھیجدیا گیا۔ زینت محل بیگم اور تاج محل بیگم اور جواں بخت ان کے ساتھ بھیجے گئے۔ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء سے ۱۴ رستمبر ۱۸۵۷ء تک بہادر شاہ کی بادشاہی میں اس طرح کی حکومت ہوئی کہ پہلا حکم بادشاہ کی طرف سے یہ صادر ہوا کہ گائے کا ذبح کرنا بند کیا گیا۔ ۹ رجولائی ڈھنڈورا پٹوایا گیا کہ جو شخص گائے ذبح کریگا وہ توپ کے مُنہ اُڑایا جائیگا۔ اسکے بعد یہ حکم صادر ہوا کہ بقر عید کے موقع پر بھی کوئی شخص گائے کی قربانی نہ کرنے پائے۔

چار مہینے تک گائے قصاب اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے رہے، اگر ان میں سے کوئی شخص باہر نکلتا تھا تو ہندو سپاہی اُس کو پکڑ کے ذبح کر ڈالتے تھے، اور کہتے تھے "جس طرح تم ہماری گائے کو ذبح کرتے ہو ہم تمھیں ذبح کرتے ہیں"۔

اس کے بعد بادشاہ سے حکم جاری کرایا کہ شہر کا ڈلاؤ اور کوڑا جو بیلوں پر لاد کر

کھیتوں میں ڈالنے کے لئے حلال خور لیجاتے ہیں وہ آئندہ گدھوں پر لد کر جایا کرے۔ بیلوں کی گائے سے قرابت داری ہے، اور ڈلاؤ لادنے میں بیلوں کی توہین ہوتی ہے، چنانچہ اس حکم پر عمل کیا گیا، حلال خوروں نے اپنے بیل بیچ ڈالے اور ان کے بدلے گدھے مول لے لئے۔ مسلمانوں کو یہ احکام ناگوار گزرے اور انھوں نے کہا یہ اسلام کی بادشاہی نہیں یہ تو ہندوؤں کا راج ہے۔ چنانچہ مولوی محمد سعید نامی ایک شخص نے جامع مسجد دہلی میں جہاد کے لئے محمدی جھنڈا کھڑا کیا۔ اس کی خبر بادشاہ کو ہوئی، اُنھوں نے مولوی صاحب کو بلا کر پوچھا کہ انگریز تو اب شہر میں باقی نہیں رہے۔ یہ جھنڈا کس کے واسطے لگایا ہے؟ مولوی صاحب نے جواب دیا، ہندوؤں کے لئے۔ جنھوں نے آپ کو اپنا تابعدار بنالیا ہے، بادشاہ نے اُن کو سمجھایا کہ تمام باغی فوج ہندو ہے، مسلمان اُن سے لڑ نہیں سکتے۔ آخر بہزار دقت یہ جھنڈا اُکھڑوایا گیا۔

شہر میں انتظام کی یہ حالت تھی کہ اکثر بازار بند رہتا تھا۔ کھاری باؤلی، چوک، دریبہ، چاوڑی میں اکثر دوکانیں دن دہاڑے لُٹ جاتی تھیں، اسکی شکایت بادشاہ سے کی گئی کہ دوکانیں اکثر بند رہتی ہیں اور ضرورت کی چیزیں دستیاب نہیں ہوتیں، بادشاہ ان کی درخواست کے موافق خود ہاتھی پر سوار ہو کر بازار میں نکلے۔ شاہی چتر، ماہی مراتب، شتری زنبورکیں، اگرئی اور کالی پلٹنیں جلوس میں ساتھ تھیں، سینکڑوں تلنگے دھوتیاں باندھے غول کے غول سواری کے آگے آگے بہادر شاہ بادشاہ کی جے۔ دین دُنیا کے گُسیاں کی جے پکارتے جاتے تھے، شاہی نقیب احکام سُناتے جاتے تھے کہ دُکانیں کھولو۔ سواری کے پیچھے ترک سواروں کا جمگھٹا تھا، جو اللہ اکبر کے نعرے لگاتے تھے، اس جلوس کا اثر یہ ہوا کہ بازار کھُل گیا،

غدر سے پہلے ڈھنڈورا اس طرح پیٹا جاتا تھا کہ نقارہ پر چوب لگا کے ڈھنڈورچی اوّل یہ کہتا تھا "خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم سرکار کمپنی بہادر کا" غدر کے بعد "حکم سرکار کمپنی" کا لفظ اُڑا دیا گیا اور اس کی جگہ "حکم بادشاہ" داخل ہو گیا۔

تلنگوں کے مظالم

باغی سپاہی مختلف اسباب سے باشندگان شہر کو قتل کرتے تھے، کسی کو عیسائی سمجھ کر اور کسی کو انگریزوں کا جاسوس خیال کر کے، سیٹھ بدری چند ڈپٹی انسپکٹر مدارس دہلی کو جو بڑے پکے سراوگی ہندو تھے، عیسائی سمجھ کر مار ڈالا کیونکہ وہ انگریزی کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ ایک کشمیری پنڈت موہن لال نامی مسلمان ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنا نام آغا حسن جان رکھا تھا مگر وہ بھی کوٹ پتلون پہنتے تھے، تلنگوں نے اُن کو کرسٹان سمجھ کر پکڑا اور قتل کرنا چاہا لیکن اتفاق سے میاں نظام الدین صاحب چشتی نظامی وہاں تشریف لے آئے اور انھوں نے پنڈت جی کے مسلمان ہونے کی شہادت دیکر جان بچائی۔

بعض شریر آدمی اپنی ذاتی عداوتوں کے سبب تلنگوں سے جا کر کہتے کہ فلاں گھر میں انگریز چھپے ہوئے ہیں، تلنگے اس گھر پر چڑھ دوڑتے اور تلاشی لیکر گھر کو لوٹ لیتے چنانچہ ریاست الور کے ملازم قاضی پنو نامی کے سگے بھانجوں نے ذاتی عداوت کے سبب جھوٹی مخبری کر کے بچارے ماموں کو بیگناہ قتل کروا دیا اور اُس کا گھر لٹوا دیا۔ ۱۲ مئی کو نواب حامد علی خاں کی نسبت جو بادشاہ کے خاص مقرب تھے، رپورٹ کی گئی کہ انکے گھر میں فرنگی پوشیدہ ہیں تلنگوں نے نہایت بیحرمتی سے نواب صاحب کو گرفتار کیا اور کشاں کشاں قلعہ میں بادشاہ کے سامنے لائے۔ بادشاہ نے مرزا ابوبکر کو نواب صاحب کے گھر پر بھیجا کہ تلاشی لو۔ اگر کوئی انگریز وہاں پوشیدہ ہو تب یہ خطاوار ہیں ورنہ ان کو چھوڑ دیا جائے۔ تلاشی میں کوئی انگریز نہیں نکلا اس لئے نواب صاحب چھوڑ دیے گئے۔ ۱۳ مئی کو نرائن داس نہروالہ

کے متعلق اطلاع آئی کہ اسکے گھر میں انگریز چھپا ہے، تلنگے گئے۔ مکان کی تلاشی لی اور دو
انگریز دستیاب ہوئے جنکو قتل کر دیا گیا اور لالہ کا مکان لوٹ لیا گیا، اسی طرح ایک درزی
کے گھر سے تین انگریز نکالے گئے اور قتل کئے گئے اور اس کا گھر لوٹا گیا۔ غرض اس شبہ
میں دو چار آدمیوں کی کمبختی روزانہ آتی تھی۔

باغیوں کا محکمۂ جاسوسی

باوجود جاہل ہونیکے باغیوں کا محکمہ خبر رسانی بہت اعلیٰ درجہ کا تھا، انکو شہر کی خبریں
بہت صحیح ملتی تھیں اور وہ جانتے تھے کہ دہلی میں کون کون لوگ انگریزوں سے سازش رکھتے ہیں
اور انکو خبریں بھیجتے ہیں، اور ان کی فوج کیلئے رسد کا سامان مہیا کرتے ہیں، چنانچہ اس شبہ میں
انھوں نے بہت سے لوگوں کو گرفتار کیا جن میں سے بعض مارے گئے اور بعض شاہی سفارش سے چھوڑ دیے
گئے۔ چنانچہ مان سنگھ اور تراب علی جو واقعی انگریزی مخبر تھے گرفتار کئے گئے مگر شہزادوں نے
سفارش کر کے چھڑا لیا۔ بادشاہ کے وزیر محبوب علی خاں اور حکیم احسن اللہ خاں اور بیگم زینت محل
کی نسبت بھی انکو جاسوسی کا شبہ تھا، چنانچہ محبوب علی خاں اور حکیم احسن اللہ خاں بھی گرفتار
کئے گئے مگر بادشاہ کی سفارش سے بمشکل رہائی پائی۔ راجہ اجیت سنگھ مہاراجہ پٹیالہ کے چچا دہلی
میں رہتے تھے، انکو دو دفعہ گرفتار کیا گیا اس الزام میں کہ وہ پٹیالہ اور انگریزی فوج کے
پاس خبریں بھیجتے ہیں، مگر بادشاہ کی سفارش سے راجہ صاحب بھی رہا ہو گئے۔ بلدیو سنگھ نامی
ایک شخص کو جو کوڑیا پل پر رہتا تھا مخبری کے الزام میں گولی سے قتل کیا گیا اور اس کی لاش
کوتوالی کے سامنے الٹی لٹکائی گئی۔ پیارے لال مدرس کو مخبری کے الزام میں توپ سے اڑا دیا گیا
رائے رام سرن داس ڈپٹی کلکٹر کے رشتہ داروں کے گھر مخبری کے الزام میں لوٹے گئے۔ کنھیا
لال حیدرآبادی اور میر حسن علی وکیل پٹیالہ بھی مخبری کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ کشمیری اور
موری دروازہ کے نان بائیوں کو اس جرم میں مار ڈالا گیا کہ وہ ڈبل روٹیاں پکا کر پہاڑی

پر انگریزوں کو بھیجتے ہیں، نواب محبوب علی خاں اور حکیم احسن اللہ خاں پر روزانہ
طرح طرح کے الزام لگائے جاتے تھے، کبھی یہ کہ انھوں نے چوڑی والوں کا میگزین اڑادیا
کبھی یہ کہ وہ انگریزوں کے پاس میگزین بھیجتے ہیں، کبھی یہ کہ اُنھوں نے سلیم گڑھ کی
توپوں میں کنکر پتھر بھروا دیے، کبھی یہ کہ انھوں نے توپوں میں میخیں ٹھکوادیں، لیکن
ان دونوں کے حلف اُٹھانے اور بادشاہ کے بار بار سفارش کرنے سے ان کی جانیں
بچ گئیں۔ درحقیقت ان لوگوں کی بڑی بدقسمتی تھی کہ غدر میں تو باغی ان پر شبہ کرتے تھے،
اور غدر کے بعد انگریزوں نے ان پر شبہ کیا اور حوالات میں مقید رکھا۔

تلنگوں کی لوٹ مار

گامی خاں پنجابی شہر کا ایک مشہور بدمعاش تھا، پیچھے اسکا بہت ذکر آیا ہے
اس نے انگریزی فوج کے ہاتھوں بہت لوگوں پر ظلم کرائے تھے لیکن غدر میں یہ باغیوں
کی ناک کا بال بنا ہوا تھا اور اُنکے ہاتھ سے شہر والوں پر ظلم کراتا تھا چنانچہ اس نے اپنے ہی
بھائی بندوں ولی محمد و حسین بخش و قطب الدین کی دکانوں کو تلنگوں کے ہاتھ سے لٹوا دیا
سب سے بڑے پنجابی سوداگر دہلی میں یہی تین تھے۔

غرض بیچارے دہلی شہر کو ۴ مہینے اور چار دن اس بادشاہی میں بھی کسی طرح کا
آرام و چین میسر نہ تھا، اور اس کی جانکنی انگریزوں کے دہلی فتح کرنیکے بعد سے نہیں بلکہ
۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء سے شروع ہو گئی تھی جسدن کہ باغیوں کا اس شہر پر قبضہ ہوا تھا۔

نتیجہ

ان تمام حالات پر مورخانہ و دوراندیشانہ غور کرنے سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ امن بہت
بڑی دولت ہے اور بے امنی میں بڑی سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج جو لوگ

انگریزوں کو اس ملک سے بزورِ قوتِ بازو نکال دینا چاہتے ہیں اُن کو ذرا تخلیہ میں بیٹھ کر یہ کتاب پڑھ لینی چاہئے، اُس وقت اُن کو معلوم ہوگا کہ جذبات عارضی سے مشتعل ہو جانا اور آنکھیں بند کر کے کوئی کام کر بیٹھنا بیگناہوں پر کیسی کیسی تباہیاں لاتا ہے

میں اُن لوگوں میں ہوں جو صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ تمام دنیا سے ہتھیاروں کی قوت کو اور لڑائی بھڑائی کے جذبات کو دور کر دینے کے آرزومند ہیں اس واسطے یہ کتاب کسی قوم یا فرقہ کے خلاف نہیں سمجھنی چاہئے۔ اس کا مقصدِ تحریر سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ انسان دردناک اور موثر مصیبتوں کا حال پڑھ کر ان حرکات اور خیالات اور ارادوں سے باز آجائے جو امن شکنی کا باعث ہوتے ہیں ٭

بتاریخ ۶ ؍ اپریل سنہ ۱۹۲۲ء یوم چہار شنبہ کو ظہر کے بعد یہ کتاب شروع کی گئی تھی۔ اور آج ۱۶ ؍ اپریل یوم یکشنبہ دن کے سوا دس بجے اس کی تحریر پوری ہوئی الحمد للہ ٭

حسن نظامی

سنہ ۱۹۲۲ء میں

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن شایع ہوا تھا اور جیسا کہ اُوپر کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے اسکی تصنیف دس روز میں ہوئی تھی۔

پھر اس کا دوسرا ایڈیشن شایع ہوا، اور اب مارچ سنہ ۱۹۲۵ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شایع ہوتا ہے ٭

کارکن حلقہ مشایخ بک ڈپو۔ دہلی